ایمل رضا

آتشِ حُب

وہ دلہن کے لباس میں تھی اور بد حواس سی گاڑی سے اتر کر بھاگتی ہوئی شہرام کے گھر پہنچی تھی۔اس سے پہلے وہ سینٹرل پارک اور فالی ریسٹورنٹ میں اسے تلاش کر چکی تھی' وہاں نہیں ملا تو اس کے گھر پر آئی تھی۔یہاں بھی اسے مایوسی ہوئی تھی۔لینڈ لیڈی نے بتایا تھا کہ وہ اپنے ملک البانیہ واپس جا چکا ہے۔

بیانکا شہر کی مقبول ترین ڈی جے تھی۔بظاہر خوش باش نظر آنے والی بیانکا کی روح میں گہرے زخم تھے جنہیں کوئی نہیں جانتا تھا۔

شہرام اس کے ہوٹل میں آیا اور ایک اتفاقی حادثے میں زخمی ہو گیا' تو اس کے بازو کی ہڈی میں فریکچر آ گیا۔

بیانکا شہرام سے پہلی نظر میں متاثر ہو جاتی ہے۔وہ اسپتال میں اس کے لیے پھول رکھ کر جاتی ہے۔شہرام جو محبت میں ناکام ہو کر بری طرح شکستہ ہے۔اس مہربانی پر چونک جاتا ہے۔

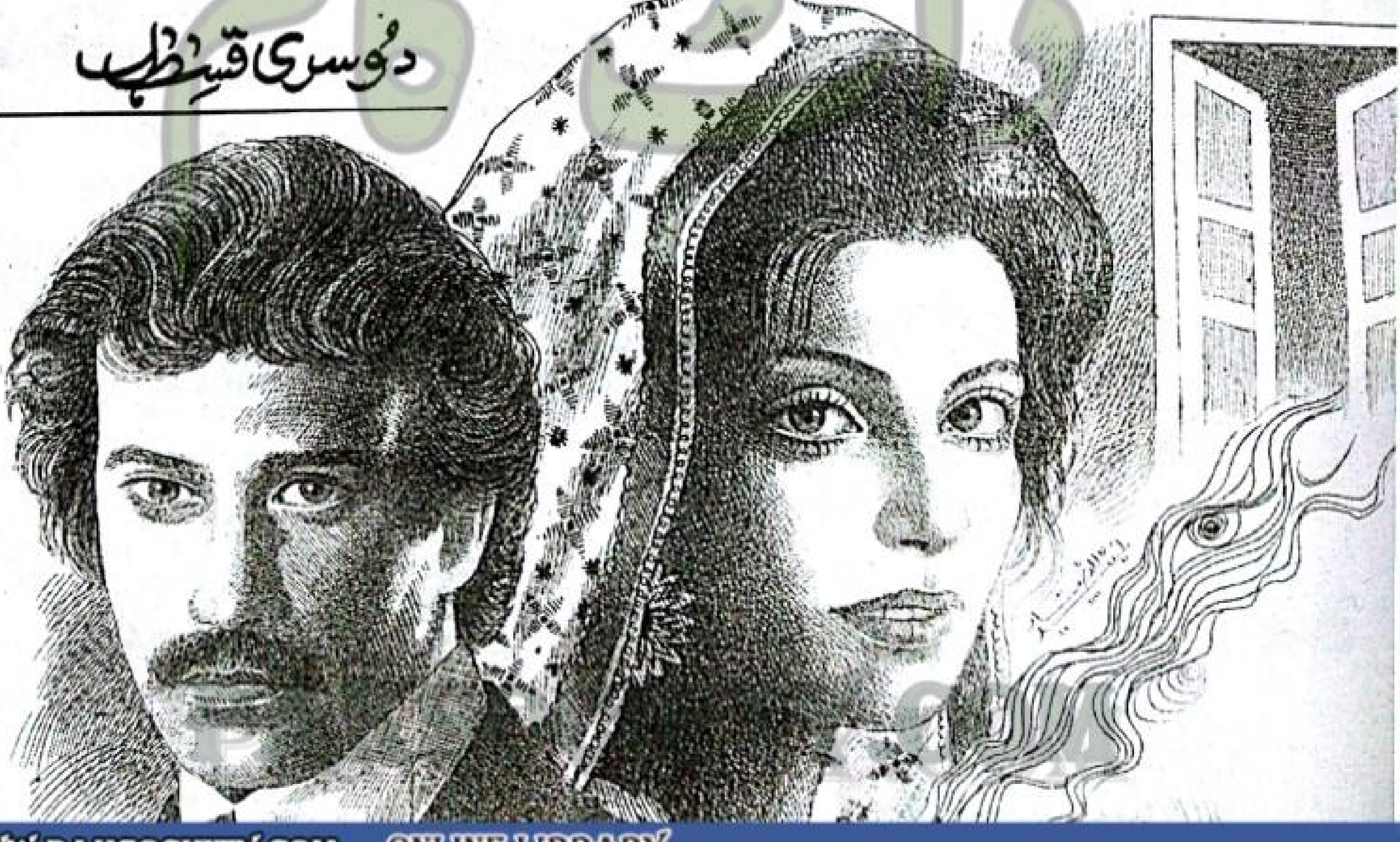
بیانکا نے مختلف گانوں کے ردھم سے ایک میش اپ تیار کیا تھا۔جوزف کا خیال تھا اس میں افسردگی کا رنگ غالب ہے۔یہ رنگ بیانکا کا اصلی رنگ تھا۔زندگی نے اس کے ساتھ بھی اچھا سلوک نہیں کیا تھا۔

بیانکا کے والد الیاس احمد پاکستان سے امریکا آئے تھے۔انہوں نے یہاں محنت کر کے اپنا مقام بنایا پھر لبنان کی حیفہ سے شادی کر لی۔اب دونوں کی ایک ہی بیٹی تھی۔بیانکا' ساری جائیداد اس کے نام پر تھی۔

الیاس احمد نے پاکستان سے اپنے بھائیوں کو بھی امریکا بلا لیا تھا۔الیاس احمد کی اچانک وفات ہو جاتی ہے۔ان کے گلے پر ایک سرخ لکیر ہوتی ہے۔

الیاس احمد کی وفات کے بعد ان کے بھائی حیفہ اور بیانکا کو بلا کر کہتے ہیں کہ وہ الیاس احمد کی ساری جائیداد ان کے نام منتقل کر دیں۔ان دونوں کے انکار پر وہ انہیں تہہ خانے میں بند کر دیتے ہیں۔بیانکا کا چچا زاد احمد میڈیکل کا ریسٹورنٹ ہے۔

دوسری قسط



بیانکا کو شک ہے کہ وہ انہیں کھانے میں کچھ غلط دوائیں دے رہا ہے۔

شہرام سیرین کو ٹوٹ کر چاہتا تھا' وہ اس کی منگیتر تھی۔ منگنی کے بعد شہرام پڑھنے کے لیے امریکا چلا جاتا ہے۔ جب واپس آتا ہے تو سیرین بدلی ہوئی نظر آتی ہے۔ وہ شادی' محبت ہر چیز سے منکر ہو جاتی ہے۔ شہرام کو یقین ہو جاتا ہے کہ اس کے پیچھے کوئی لڑکا ہے۔ وہ اس کا پتا لگا کر اسے مارنے کا تہیہ کر لیا ہے۔

حیفہ اور بیانکا کو اس کے چچاؤں نے تہ خانے میں قید کر رکھا ہے۔

مکمل ناول



اس نے اپنی خوراک بستر مرگ پر پڑے ہوئے مریض سے بھی کم کردی تھی اور صبح شام نفرت کی اس کہانی کو بار بار اپنے ذہن میں دہرانے لگی تھی۔ کہانی کے اختتام تک وہ اس بات پر قائم بھی رہتی تھی کہ وہ کسی صورت کاغذات پر دستخط نہیں کرے گی۔ آج ان کی بچھائی بساط کے سارے مہروں نے بیانکا کی بساط کی ترتیب کو مات دے دی تھی۔

"کھانا کھالو بیانکا بیٹی....."

اپنی کھانسی کو اسے مزید پریشان نہ کرنے کی غرض سے روکے ہوئے مام اس کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔ بیانکا نے اپنی آنکھیں کھولیں اور حیفہ مام جیسے سانس لینا بھول گئیں۔

وہ رو نہیں رہی تھی۔ آنکھوں میں اتنی طاقت ہی نہیں رہی تھی بس نمکین پانی کی تہہ تھی جو آنکھ کی شفاف پتلی پر چڑھ گئی تھی۔ نیم اندھیرے میں یہ آنکھیں کسی پہاڑی قلعے پر واقع لائٹ ہاؤس کی طرح چمکتی تھیں اور ان آنکھوں سے بیک وقت شیر کی سی بہادری اور گیدڑ کی سی بزدلی جھلک رہی تھی۔

"اٹھو بیانکا....." آنسو ضبط کرتے ہوئے حیفہ مام نظریں چرا گئیں۔

بیانکا کو حیفہ مام کا چہرہ افسردہ کر گیا۔ دونوں بے بس تھیں۔ وہ دکھ سے حیفہ موم کی طرف دیکھنے لگی۔

"یہ..... یہ کیا ہے؟" اچانک بیانکا ایک جھٹکے سے اٹھی تھی۔ حیفہ مام کی گردن کے نیچے دائیں طرف سرخ نشان کی ایک لمبی سی دھار تھی۔

"کیا.....؟"

"یہ....." وہ حیفہ مام کو مزید روشنی میں لے گئی۔ یہ ہی نشان وہ ڈیڈ الیاس کی گردن پر بھی آخری وقت میں دیکھ چکی تھی۔ بیانکا نے خود کو تیزی سے پاتال کی طرف گرتے ہوئے محسوس کیا۔

"ہاں..... مجھے بھی یہاں جلن سی ہو رہی ہے۔ میرے خیال سے تکیے کی سائیڈوں کی ڈوری ہے جس نے گردن پر یہ نشان چھوڑ دیا ہے۔"

حیفہ مام نے وضاحت دی تھی۔ بیانکا نے تیزی سے آگے بڑھ کر تکیہ اٹھایا تھا۔ تکیے کے ارد گرد واقعی موٹی ڈوری بنی ہوئی تھی۔

"کیا ہوا بیانکا.....؟ اتنی پریشان کیوں ہو گئی ہو۔ صرف جلن کا نشان ہی تو ہے۔ خود بخود ٹھیک ہو جائے گا۔"

وہ بڑی دیر تک تکیے کو دونوں ہاتھوں میں تھامے ساکت رہی تھی اور جب اس نے پلکیں اٹھائی تھیں تو اس کی پتھرائی آنکھیں اور چٹان چہرہ حیفہ مام کو نظر آیا تھا۔ ان کو رونا آگیا تھا۔

"یہ..... یہ....." وہ کچھ کہہ نہ سکی۔ اس کے تصور کی آنکھ بھٹکتے بھٹکتے بہت دور نکل گئی تھی۔

ڈیڈ الیاس کا وجود اور اوپر کے پانچوں ابلیسوں میں سے کسی ایک کا تکیے سے ان کا منہ ڈھانپ دینا..... کسی دوسرے کا ان کے بازو پکڑ لینا اور کسی تیسرے کا ان کی ٹانگیں..... ڈیڈ الیاس ہاتھ پاؤں چلا رہے ہیں۔ بندھے ہوئے کسی جانور کی طرح جو ذبح ہونے کے لیے چھری دیکھ لیتا ہے' تڑپ رہے ہیں' لیکن ان کے چہرے سے تکیہ نہیں ہٹایا جا رہا۔ ان پر ترس نہیں کھایا جا رہا۔ وہ سانس ڈھونڈ رہے ہیں اور سانس کی ہلکی سے ہلکی ہوتی درز کسی اندھیرے غار میں بدلتی جا رہی ہے۔ بالآخر غار کے آگے پتھر آجاتا ہے..... گھپ اندھیرا..... انسان کا مقسوم.....

"بولو بیانکا..... اللہ کے لیے کچھ تو بولو....."

وہ چونکی' لیکن بول نہ سکی۔ اس کا تصور ٹوٹ گیا تھا' لیکن اس حقیقی تصور کی ہیبت ختم ہونے میں نہیں آرہی تھی۔ اس کی پتھرائی آنکھوں میں پانی بھر آیا۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دیتی اگر اسے حیفہ مام کے بھی ایسا ہی کرنے کا ڈر نہ ہوتا۔

"بیانکا دل کرے تو رو لیا کرو..... لیکن خدا کے لیے اس طرح ساکت نہ ہو جایا کرو..... یہ غار مجھے شاید نہ مار سکے' لیکن تمہاری ایسی صورت مجھے ضرور ختم کر دے گی۔"

بیانکا نہیں چاہتی تھی کہ تصور کی جس آنکھ سے اس نے ڈیڈ الیاس کو تکیے تلے چہرہ دبے سانس اکھڑتے

اور لمحہ بہ لمحہ مرتے دیکھا ہے۔ حیفہ مام بھی اس کی زبان سے اس بھیانک تصور کو جالیں۔

"کچھ نہیں۔۔۔ بس مجھے ڈیڈ الیاس کی یاد آگئی تھی۔"

وہ حیفہ مام کی نظروں کی تاب سے پرے ہٹ گئی۔ ہونٹوں کو سختی سے بھینچ کر اور آنکھوں کو تیزی سے ایسے بند کرتے ہوئے کہ جیسے ان میں مرچیں بھر دی گئی ہوں' اس نے ڈیڈ الیاس کے قتل کے راز کو دبانے کی کوشش کی تھی اور اس کوشش نے اس کے چہرے کے سارے خدوخال کو بگاڑ کر رکھ دیا تھا۔

"کھانا کھالو۔۔۔" حیفہ مام کہتی جارہی تھیں۔۔۔ اور وہ دل ہی دل میں دھاڑیں مار مار کر رونے لگی تھی۔ جیسے ابھی ابھی اس نے ڈیڈ الیاس کی موت کی خبر سنی ہو۔

تب پہلی بار بیانکا کو اندازہ ہوا تھا کہ وہ کسی مشکل میں گرفتار نہیں ہوئی ہیں' بلکہ اگر اس نے کوئی بھی فیصلہ کرنے میں دیر کردی تو وہ ایک ایسے خونی کھیل کا حصہ بن جائیں گی' جس میں دونوں طرف سے ان کا ہی خسارہ ہوگا۔

☼ ☼ ☼

"وہ کسی اور کو پسند کرتی ہے۔"

مدہوش صبح کو کوئی پانی کے چھینٹے مار مار کر جگا رہا تھا۔ صاف آسمان پر قوس قزح کے ساتوں رنگ بکھرے تھے۔ یہ قوس کسی کمان کی طرح اور اس میں سے نکلنے والی شعاع کسی تیر کی طرح دکھتی تھی اور یہ تیر کمان سفید بادلوں والے **قنطورس** (آدھا انسان آدھا گھوڑا) کے ہاتھ میں تھی۔

"اس نے کل صبح مجھے بتایا۔"

شہرام نے آسمان پر ٹکٹکی باندھتے ہوئے کہا۔ طامیر کے گھر کے صحن میں پڑے بند پنجرے میں موجود ریوالی کبوتروں کی غڑغوں اس آواز سے کہیں زیادہ تیز تھی۔

"تم اس کا کہا مان کیوں نہیں لیتے۔ تم واقعی اسے بھول کیوں نہیں جاتے۔ جو کچھ اس نے کیا قصوروار صرف وہ ہے۔ پھر تم کیوں خود کو اذیت دے رہے ہو۔" طامیر کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ شہرام کو کیسے سمجھائے۔

"وہ یہ کیسے بھول گئی کہ وہ میری منگیتر ہے۔۔۔ میری محبت۔۔۔ ایسی غفلت کا تو ایک لمحہ بھی گناہ ہوتا ہے اور دل بدل جانا لمحوں کی بات نہیں ہوتی۔ بہت دنوں تک انسان کے اندر کشمکش چلتی رہتی ہے۔ انسان جوڑ توڑ کرتا رہتا ہے۔"

شہرام کے تیور طوفان کی زد میں آئے درختوں کی طرح بگڑ رہے تھے اور طامیر کو ان بگڑتے ہوئے تیوروں سے بڑا خوف محسوس ہو رہا تھا۔ وہ اسے گھنٹوں سمجھا سکتا تھا اگر اسے ذرا سا بھی یقین ہوتا کہ اس کی باتوں کو سنا ہی جارہا ہے۔

"پورا ارجیر جانتا ہے کہ ہم دونوں کی منگنی ہوچکی ہے۔ ایسے میں اس کے قریب آنے کی جسارت کون کرسکتا ہے؟"

سورج کی شعاعیں تیکھی ہوگئی تھیں۔ اور تیر کمان سے نکل گیا تھا۔ معصوم **قنطورس** سوچ سمجھ کر لگائے جانے والے ہدف کو بھیگی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔

"تم۔۔۔ تم اس لڑکے کو جانتے ہو طامیر۔۔۔؟ کسی پر شک ہے تمہیں؟"

شہرام کہتے ہوئے پلٹا تھا اور طامیر اپنی نظروں کے زاویے کسی ایک جگہ مرتسم نہ کرسکا تھا۔

"نہیں۔۔۔" بڑی مدھم آواز سے اس نے کہا۔ "تم نے سیرین سے ہی کیوں نہ پوچھ لیا۔"

"اس نے نہیں بتایا۔"

"یہ کوئی ایسی بات نہیں ہے جسے تم اتنی شدت سے جاننا چاہتے ہو۔ اس جان کاری میں تکلیف کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں ہے۔"

"نہیں میں جاننا چاہتا ہوں۔" شہرام چلایا تھا۔ "اسے گریبان سے پکڑ کر جھنجوڑنا چاہتا ہوں۔۔۔ درحقیقت۔۔۔ درحقیقت میں اس لڑکے کو جان سے مار دینا چاہتا ہوں۔۔۔ جس نے سیرین کو بہکایا۔"

"تم اس لڑکے کو کیوں جان سے مار دینا چاہتے

ہو۔ اگر وہ قصور وار ہے تو سیرین بھی بے قصور تو نہیں۔"

زمین پر نظریں گاڑے گاڑے وہ اپنے عزائم میں جیسے ردوبدل کرنے لگا۔

"ہاں۔ ٹھیک کہا... سیرین بے قصور تو نہیں... ٹھیک ہے میں دونوں کو ماردوں گا... ختم کردوں گا... کم از کم اس طرح دنیا سے ایک بے وفا تو کم ہو گا... محبت کی بے قدری کرنے والا۔"

"اتنی شدت سے مت سوچو شہرام... ایسا رویہ تم پر نہیں جچتا۔"

"کیا تم میرا ساتھ دو گے؟"

"تم غصے میں ہو شہرام... بہتر ہے کہ تم امریکا واپس چلے جاؤ۔ یہاں تم پاگل ہو جاؤ گے بلکہ کسی حد تک ہو چکے ہو۔"

"مجھے اپنی یہ صورت حال قبول ہے... میں ٹھیک ہونا نہیں چاہتا۔"

طامیر نے دکھ بھری نظروں سے اپنے دوست کو دیکھا تھا۔

"اس لڑکے کو ڈھونڈو گے کیسے...؟" بڑی دیر بعد اس نے پوچھا۔

"جب وہ سیرین سے ملنے آئے گا تب..."

شہرام سب کچھ پلان کر کے بیٹھا تھا۔ اس بات نے طامیر کو مزید دکھی کر دیا۔

☼ ☼ ☼

روشنی کی ایک لمبی تکونی لکیر تھی جو سنگ برج سیناں کی تختی کے اوپر بچھ کر ساکن تھی۔ بابا زلاری اسی روشنی کی لکیر کو دیکھ کر ٹھٹک کر رو کے تھے۔ شاید ملازم آج اندر ریسٹورنٹ کی لائٹس کو بند کرنا بھول گئے تھے، لیکن پھر شٹر کو دیکھ کر وہ مزید پریشان ہو گئے تھے۔

شٹر کے دونوں طرف کے تالے غائب تھے۔ زنیتو سیہ کے ہوتے ہوئے کوئی ملازم اتنی بڑی غلطی کیسے کر سکتا ہے ارجیر ایک پرامن علاقہ تھا، چوری چکاری کا زیادہ ڈر نہیں تھا، لیکن احتیاط میں تو کسی بھی صورت کوتاہی نہیں ہونی چاہیے۔

دوپہر کو ریسٹورنٹ کے تالے کھولتے وقت تالوں کو شٹر کے آہنی کنڈوں میں اٹکا دیا جاتا تھا۔ رات گئے جب ریسٹورنٹ بند ہوتا تو شٹر کے ساتھ تالے بھی واپس نیچے آ جاتے تھے۔ اس طرح تالا لگانے میں چوک چاہ کر بھی نہیں ہو سکتی تھی۔

تو کیا اندر چور تھے؟

دیوار کے ساتھ جڑ کر انہوں نے شٹر کے ساتھ کان لگا دیے۔

کچھ مبہم سی آوازیں تھیں۔ اندر ہی کہیں سے آتی ہوئی پر جو بھی گفتگو ہو رہی تھی، بہت غصے اور تیزی سے ہو رہی تھی۔ بڑی دیر تک وہ گفتگو کی نوعیت کو سمجھ نہ پائے۔ پھر انہوں نے ایک آواز کو پہچان لیا تھا۔

وہ شہرام کی آواز تھی۔ تب گفتگو کی نوعیت بھی ان کی سمجھ میں آنے لگی۔

ہلکے سے شٹر کے کنڈے پر ہاتھ ڈال کر انہوں نے اسے اوپر اٹھا ڈالا۔

اسٹور روم کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ شہرام اور طامیر کی آوازیں وہاں سے ہی آرہی تھیں۔ اندر جانے سے پہلے وہ سب کچھ جان لینا چاہتے تھے۔

طامیر کرسی پر جھکا بیٹھا تھا اور شہرام زمین پر پڑی "سان" پر کوئی پرانا خنجر تیز کرنے میں مصروف تھا۔

"تو تم انہیں قتل کرنا چاہتے ہو؟" ایک آہنگ نرمی سے بابا زلاری نے پوچھا۔ دونوں نے چونک کر بابا زلاری کو دیکھا۔ شہرام کے کام کرتے ہاتھ رک گئے تھے اور اس کی جھکی آنکھیں اٹھ کر دوبارہ مزید نیچے تک جھک گئی تھیں۔

"بولو... تم انہیں قتل کرنا چاہتے ہو... تم قاتل بننے جا رہے ہو۔"

شہرام کچھ نہیں بولا تھا اور طامیر اپنے اندر نظریں چار کرنے کی ہمت نہیں پاتا تھا۔

"جو لفظ تمہیں اتنی شرم دلا رہا ہے۔ اتنا ہیبت ناک ہے کہ تم اس کی تصدیق بھی نہیں کر پا رہے... وہ عمل

تم کیونکر کر گزرو گے؟"

"ہاں' انہوں نے مجھے دکھ دیا ہے... میری زندگی کا سب سے بڑا غم دیا ہے... مجھے اس جنون میں مبتلا کرنے والے وہ دونوں ہیں... میں اکیلا اس آگ میں جلنا نہیں چاہتا... مجھے راکھ کے ڈھیر میں دھنسا کر وہ دونوں خوش نہیں رہ سکتے... میں ان سے ان کی ہر خوشی چھین لوں گا... میں دونوں کو ختم کردوں گا۔"

شہرام نے تیزی سے کہا تھا' لیکن اس کے ہاتھ گزشتہ کام پورا کرنے کے لیے حرکت نہ کرسکے تھے۔

بابا زلاری اور طامیر نے بے ارادہ ایک دوجے کی طرف دیکھا تھا۔ دونوں دکھ کی وہ کیفیت محسوس کررہے تھے جو کسی اپنے کی اذیت پر آنکھوں میں نجانے کہاں سے اُمڈ آئی ہے۔

"تم ہونہار تھے... مجھے دکھ ہوا کہ تم بھی فریبی جذبوں کے پجاری نکلے... کیا اس طرح تمہارے دل کو قرار آجائے گا؟"

"پتا نہیں... لیکن اس بے قراری سے بہت بہتر کہ میں آنے والے وقت کے قرار کو حاصل کرنے کے لیے اپنی سوچ پر عمل درآمد کر گزروں۔"

"حالانکہ وہ قرار سراسر شک پر مبنی ہے۔"

"آپ میں اور ہم میں یہ ہی تو فرق ہے بابا... آپ کی تعلیم اس قدر مستند ہے کہ ہماری اسناد اس کے آگے خود بخود ہی رد ہوجاتی ہیں۔ بہتر ہے آپ مجھے جاہل ہی رہنے دیں۔" شہرام تلخی سے بولا تھا۔

"اور اگر پھر بھی تم مطمئن نہ ہوئے تو؟"

"تو میں... میں خود کو ختم کرلوں گا۔"

"تمہاری چھٹیاں کل ختم ہوجائیں گی... تم امریکا واپس چلے جاؤ... وہاں جاکر سکون سے سوچو... یقیناً وقت گزرنے کے ساتھ تم اپنی آج کی سوچ پر پچھتاؤ گے... تمہاری ماں کی حالت بھی مجھ سے دیکھی نہیں جاتی... اس نے اب "دسلی" کہنے پر چڑنا بھی بند کردیا ہے۔ وہ تمہارا دکھ نہیں دیکھ سکتی اور میں غم زدہ حالت میں اس کو... اس کے کباب بھی اب جلنے لگے ہیں۔ اس کا بیس سال کا تجربہ رائیگاں ہورہا ہے۔ ان میں اب کوئی خوشبو نہیں آتی... آنسوؤں کی نمی کا گمان غالب رہتا ہے... کسٹمرز شکایت کرتے ہیں تو وہ آگے سے رونے لگتی ہے... اس کے بس میں تمہارے لیے کرنے کو کچھ ہوتا تو وہ ضرور کر گزرتی... وہ سیرین کو غلام کی حیثیت سے خرید لیتی... چاہے... چاہے بدلے میں ساری زندگی خود اس کی غلام بن جاتی' لیکن افسوس یہ دل کے رجحان کسی کے کہنے سے نہیں بدلتے... ان پر ازل سے اللہ ہی غالب رہا ہے... اس لیے ہمارے اور تمہارے لیے یہ ہی بہتر ہوگا کہ تم کل واپس چلے جاؤ... جو بے وفا ہے اس کے لیے اپنی زندگی اپنا کیریئر داؤ پر مت لگاؤ۔"

ان سب باتوں کا شہرام پر الٹا ہی اثر ہوا تھا۔

"آپ کے لیے یہ سب کہنا آسان ہے بابا... کیونکہ آپ کی زندگی میں اماں زیتو یہ جیسی خاتون رہی ہیں' جنہوں نے ہمیشہ ہر مشکل کو آپ تک پہنچنے سے پہلے خود پر سہا ہے... آپ پر ہر مشکل... ہر غم چھن کر پہنچا ہے بابا... اس لیے آپ میرے غم کا اندازہ بھی نہیں لگا سکتے... میرا دل درد سے پھٹا جارہا ہے اور آپ چاہتے ہیں کہ میں یہاں سے چلا جاؤں... کیا آپ ایک بیٹے کا پاگل ہوجانا برداشت کرپائیں گے... بولیے... بولیے بابا۔"

"تم پاگل نہیں ہوگے... محبت میں سیاہ چوغہ پہن لینا آسان نہیں ہوتا... یہ پہن بھی لو تو نبھانا مشکل ہوجاتا ہے۔"

"آپ کہتے تھے نا کہ عورت سلی ہے۔ چھوٹے وار کرنے والی اور مرد سان ہوتا ہے پھر مجھے مرد بننے دیں بابا... مجھے بڑا وار کرنے دیں۔" شہرام کی آنکھوں میں نمی بھر گئی تھی۔

اب بابا زلاری کچھ نہیں بولے تھے۔ شہرام کی آنکھوں کی نمی دیکھ کر ان کی اپنی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے تھے۔ طامیر بھی زمین پر بچھی جاجم کے جال کو کھوجنے لگا تھا۔

پھر بابا زلاری بھی شہرام کے ساتھ زمین پر بیٹھ گئے اور خنجر کو انہوں نے شہرام کے ہاتھ سے لے لیا۔

"کیا تم اتنے بہادر ہو؟" خنجر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے انہوں نے پوچھا تھا۔ "بدلہ تمہاری سرشت میں شامل نہیں ہے شہرام... تمہیں تو گلہریوں جن سے تم اتنی نفرت کرتے ہو ان پر بھی ترس آجاتا ہے۔"

"اب میں وہ بزدل شہرام نہیں رہا۔" وہ دوٹوک گویا ہوا۔ بابا زلاری کی مداخلت اسے اب بری لگنے لگی تھی۔

"بے خوفی بعض اوقات بے ضمیر بھی کردیتی ہے... یہ بڑی تشویش ناک حالت ہوتی ہے۔ پھر اب تو میں بھی تمہاری اس بے خوفی کو دیکھنا چاہوں گا۔ تمہاری ہمت اور جرات کو پرکھنا چاہوں گا۔"

خنجر کو ٹیڑھا کرکے بابا زلاری نے اس کی دونوں طرف کی دھار کو باری باری انگلی کی پور سے چھو کر جانچا تھا اور پھر شہرام کو واپس پکڑایا تھا۔

"اس طرف سے دھار کو تھوڑا اور تیز کرو شہرام... ! کسی اپنے پیارے کے سینے میں خنجر اتارنے کے لیے ہمارا جنون صرف چند لمحوں کا ہی ہوتا ہے... اگر تم نے اس طرح عجلت میں کام کیا تو وہ بھی تڑپتے رہیں گے اور تم بھی... بہتر ہے کہ کوئی ایک تو تسلی حاصل کرے۔"

بابا زلاری نے بڑے پتے کی بات بتائی تھی اور سان پر خنجر کی رگڑ کی آواز دوبارہ پھیلنے لگی تھی۔

☆ ☆ ☆

تہہ خانے کی دیواریں کچھ مزید تنگ ہوگئی تھیں۔ اور چھت اور فرش نے آپس میں مل جانے کی ٹھان لی تھی۔ ایسے میں حیفہ مام کی آواز اس کھنکھناتے سکے کی مانند تھی جو کسی دھاتی ڈبے میں اندر ہی اندر کہیں بجتا چلا جارہا ہو۔

"مجھ سے وعدہ کرو بیانکا... تم ایسا ہرگز نہیں کروگی۔"

حیفہ مام نے اپنی کھانسی ضبط کرکے رکاوٹ اور لرزتی آواز میں کہا تھا۔ یہ جملہ بولنے کے لیے انہیں اپنی بہت سی قوتوں کو یکجا کرنا پڑا تھا۔ جیسے اس ننھے سے تہہ خانے میں ایک جگہ بیٹھے رہنے کے باوجود بھی ان کے پیروں پر چھالے پڑ کر درد کرنے لگے ہوں۔

"چاہے کچھ بھی ہوجائے... میری جان ہی کیوں نہ چلی جائے... تم ان لوگوں کو ایک پینی بھی نہیں دوگی۔"

رک کر حیفہ مام نے اپنا سانس درست کیا۔ دوبارہ بولنے میں انہیں کئی زمانے بیت گئے۔

"یہ سب الیاس نے صرف محنت سے نہیں بنایا... ان ساری چیزوں میں اس کے ہاتھوں کی خوشبو رچی بسی ہوئی ہے۔ میں ان چیزوں کو کبھی ان کے ناپاک ہاتھوں میں جاتے ہوئے برداشت نہیں کرپاؤں گی۔" اب حیفہ مام باقاعدہ بے قاعدہ طریقے سے رونے لگی تھیں۔

"وعدہ کرو بیانکا تم ایسا کچھ بھی ہرگز نہیں کروگی... ایسی سوچ کو بھی گناہ سمجھوگی۔ یہ لوگ شیطانی حربے آزما رہے ہیں ان کو آزمانے دو... یہ مزید کیا کریں گے... کیا تمہیں اور مجھے قتل کردیں گے... کسی کو قتل کرنے کے لیے بڑی ہمت چاہیے اور یہ لوگ اتنے ہی بزدل ہیں۔"

وہ خاموشی سے اور بھیگی آنکھوں سے حیفہ مام کی باتیں سنتی رہی۔ اس نے حیفہ مام کی غلط فہمی دور کرنے کی کوشش نہیں کی تھی کہ یہ لوگ کس حد تک نڈر اور جرات مند ہیں اور یہ کہ ان کی بہادری گناہ کے درجوں پر فائز ہوچکی ہے۔

سردی دن بدن بڑھنے لگی تھی۔ موسم میں ایک دم سے ہی شدت آتی جارہی تھی۔ پہاڑی علاقوں پر برف باری کا آغاز ہوچکا تھا۔

اس صبح جب پہلے زینے پر کھانا رکھا گیا تو بیانکا نے تقریباً چیخ کر اور التجا آمیز لہجے میں مزید کمبلوں کا مطالبہ کیا تھا۔ اسے خود کی تو کوئی پروا نہیں تھی لیکن حیفہ مام روز بروز کمزور ہوتی جارہی تھیں اور چھال اترے سفیدے کی طرح سفید... ایک ایک لحاف ان دونوں کے لیے ناکافی تھا۔ وہ دونوں لحاف اکٹھے بھی جوڑ کر

سوتی تب بھی سردی ،کپکپاہٹ رکنے کا نام نہیں لیتی تھی۔ ان کی جھریوں زدہ نحیف آنکھوں میں کاجل کی کالی دھار سلوٹوں میں بٹ گئی تھی۔

پندرہ دنوں کے گزرتے وقت نے ہر آس کو ختم کردیا تھا۔

دوپہر کے وقت جب پھر کھانا رکھا گیا تو بیانکا نے دوبارہ کمبلوں کا مطالبہ کیا۔

اور رات کے کھانے پر اسے جواب مل گیا۔

کسی طرح کی امید رکھنا عبث تھی... ہاں ٹھیک کہا تھا ان لوگوں نے کہ وہ کسی فائیو اسٹار ہوٹل میں قیام نہیں کررہیں۔ وہ ان دونوں کو جب چاہے ختم کرسکتے ہیں۔"

پھر ساری رات حیفہ مام کی بندش زدہ کھانسی سنتے رہنے کے بعد اس نے دل کڑا کرکے رات ہی رات میں ایک فیصلہ کرلیا تھا۔

"مام کو میڈیسن کی ضرورت ہے۔" اس نے دروازے کی چھلی ہٹی ہوئی درز سے منہ لگا کر کہا تھا۔

تختی دوبارہ لگانے والے ہاتھ تھوڑی دیر کو رکے تھے۔

"ان کی طبیعت بہت خراب ہورہی ہے۔"

اپنی بات پر توجہ دیے جانے پر وہ مزید جوش سے چلائی۔ اب کے رکے ہوئے ہاتھ تختی کو دوبارہ چوکھٹے میں لگانے لگے تھے۔

"میں ایک بڑی رقم دینے کے لیے تیار ہوں۔"

اس نے آخری ہتھیار چلایا۔ رات ہی اس نے یہ فیصلہ کرلیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ ایک بڑی رقم ان سب کے منہ پر دے مارے گی اور وہ کتوں کی طرح اس کی پھینکی ہڈی پر قناعت کرلیں گے۔ دروازہ کھول کر اسے باہر بلایا گیا تھا۔

بڑے دنوں بعد... جیسے ایک عرصے کے بعد وہ تازہ کھلی فضا میں آئی تھی۔

حیفہ مام تہہ خانے میں بند نہ ہوتیں تو وہ کسی بھی طرح یہاں سے بھاگ جانے میں کامیاب ہوجاتی چاہے اسے ان پانچوں کو قتل ہی کیوں نہ کرنا پڑتا۔

"تم اتنی بے وقوف نہیں ہو جتنی تمہاری ماں... تم یقیناً" سمجھتی ہو کہ بھائی زندہ ہوں تو مرے ہوئے بھائی کی دولت پر ان بھائیوں کا حق زیادہ ہوتا ہے۔" تایا غفار نے کہا تھا۔

"مام کی طبیعت خراب ہے... انہیں ڈاکٹر کے پاس جانے کی ضرورت ہے۔" وہ ان پانچوں کے ہجوم میں گھری صوفے پر بیٹھی لاحاصل مطالبہ کررہی تھی۔

"یہ اب تم پر منحصر ہے کہ تم ساری صورت حال کو کس رخ پر موڑتی ہو۔" تایا غفار نے کاغذات نکال کر ایک بار پھر اس کے آگے رکھے تھے۔

"میں ایک بڑی رقم دے سکتی ہوں، لیکن میں ان کاغذات پر سائن نہیں کروں گی۔"

"بے وقوفی کرو گی..."

"ایک جوتی ماریے اس کے منہ پر، کیسے نہیں مانے گی یہ۔" چاچی فیروزہ نے کہا تھا۔

"اپنی ماں پر گئی ہے... ڈھیٹ، کمینی، مکار، حرافہ..." تائی شہناز بھی بولی تھیں۔ انہیں حیفہ سے سالوں کی خار تھی۔

"ڈھیٹ، کمینی، مکار، حرافہ..." اسے یہ چاروں وصف خود میں اور اپنی مام میں ڈھونڈنے سے بھی نظر نہیں آتے تھے۔

"ہم تم پر کوئی ظلم نہیں کررہے..."

وہی پرانی بات... پتھرائی آنکھوں والے اندھے لوگ...

بیانکا غم سے ان کی طرف دیکھنے لگی۔

"تمہارے پاس حیفہ کا اپارٹمنٹ اور بینک بیلنس..."

"بس کیجیے بھائی صاحب... بہت سمجھالیا اس حرافہ کو۔"

چچا جلال نے تایا غفار سے کہا تھا۔ پھر انہوں نے بیانکا کے بال پکڑ کر اسے جیسے نیند سے جگایا تھا۔ اس اچانک حملے کے لیے وہ تیار نہیں تھی۔ ایک کراہ اس کے حلق سے نکلی۔

"حرام زادی کرو دستخط..." وہ تکبر سے چلائے تھے۔

"حرام زادی..." وہ اس لفظ کا مطلب نہیں جانتی

تھی ورنہ اسی وقت مرجانے کو ترجیح دیتی۔

"نہیں کروں گی۔۔۔" وہ اپنے بال چھڑانے کے لیے مزاحمت کرنے لگی۔

"تیل چھڑک کر آگ لگادو اس کو اور اس کی ماں کو پھر۔۔۔" شہناز نے کہا۔

"آخری بار پوچھ رہا ہوں۔۔۔ یہاں سائن کرو گی یا واپس نیچے جاؤ گی۔"

احمد آگے بڑھ کر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھنے لگا تھا۔ قدرت کے نظام میں اس کے انجام کو دیکھ کر ایک استہزائیہ مسکراہٹ بیانکا کے لبوں پر آگئی تھی۔ احمد نے اپنی دانست میں اس مسکراہٹ کو انکار سمجھا تھا۔ بالکل صحیح سمجھا تھا۔

"پھر مر اپنی ماں کے ساتھ۔۔۔"

ایک جھٹکے سے اٹھ کر اس نے بیانکا کے بال پکڑے تھے۔ پھر گھسیٹتا ہوا واپس تہہ خانے پر لایا تھا اور سیڑھی سے نیچے لڑھکا دیا تھا۔ ایک بار پھر تعفن زدہ تہہ خانے کی فضا نے اس کا دم گھونٹ دیا تھا۔

فٹ بال کی طرح سیڑھیوں سے لڑھک کر گرتے ہوئے وہ نیچے جاکر ساکت ہوگئی تھی۔ مام نے جلدی سے آگے بڑھ کر اسے سنبھالا تھا۔ پھر دونوں ایک دوجے کے گلے لگ کر رونے لگی تھیں۔

"تم نے ایسا کیوں کیا بیانکا۔۔۔ جو لوگ خود ہاتھوں میں کاسہ لیے ہوئے ہوں وہ کسی دوسرے کی التجا کب سنیں گے۔۔۔ تمہیں میرے علاج کی بھیک نہیں مانگنی چاہیے تھی۔۔۔ ابھی میں اتنی بھی کمزور نہیں ہوئی۔"

بڑی دیر تک روتے رہنے کے بعد حیفہ مام نے اس سے کہا تھا۔ ہمت نہیں ہارنا میری بچی۔۔۔ گھبرانا نہیں۔۔۔ ورنہ تمہارے ڈیڈ الیاس کی روح برا مان جائے گی۔"

"مجھے اپنے سے زیادہ آپ کی فکر ہے مام۔" وہ مزید رونے لگی۔

"میری فکر نہ کرو میری بچی۔۔۔ میں ٹھیک ہوں۔۔۔ لیکن تم ایسا کرنے کا دوبارہ نہ سوچنا۔۔۔ میں مر کر بھی ایسا نہیں ہونے دوں گی۔"

حیفہ مام کے ان الفاظ نے بیانکا کے اندر ایک نئی ہمت اور طاقت پیدا کی تھی۔ آنسو خشک کر کے وہ ایک نئے عزم سے سوچنے لگی تھی۔

اگلے دن صبح اس کے سارے عزائم رخصت ہوگئے تھے۔

ساری رات بیانکا جاگتی رہی تھی اور حیفہ مام بھی۔۔۔ کھانسی کو ضبط کرتے کرتے جب وہ نڈھال ہو جاتی تھیں تو اپنا منہ لحاف کے اندر تک لے جاتی تھیں۔

پھر جب صبح کی پہلی کرنیں تہہ خانے کے اندر اترنے لگیں تو ایک منظر نے بیانکا کا سارا وجود تاریک کر دیا تھا۔

حیفہ مام کا لحاف خون آلود تھا۔

وہ دیوانہ وار دروازے کی طرف بھاگی تھی۔۔۔ اور دونوں ہاتھوں سے دروازہ بجاتے ہوئے وہ پوری جان لگا کر چلائی تھی۔

"میں سائن کرنے کے لیے تیار ہوں۔۔۔ میں سائن کرنے کے لیے تیار ہوں۔"

اسے زیادہ دیر تک چلانا نہیں پڑا تھا۔ دروازہ تھوڑی دیر بعد ہی کھل گیا تھا۔

وہ رات حاملہ تھی۔۔۔ ان گنت اندھیروں سے۔

اماں زیتوبیہ نے اسے منع کیا تھا کہ وہ آج کی رات گھر سے باہر نہ نکلے۔ وہ ہر روز صرف آج کی رات پر خاص تاکید کیا کرتی تھیں۔ شہرام جانتا تھا کہ یہ آج کی رات کل بھی آئے گی۔ وہ بہانے بہانے کی گئی ان تاکیدوں کو بھلا اب کہاں سننے والا تھا۔

اس کی چھٹیاں ختم ہوئے کافی دن گزر چکے تھے۔ لیکن وہ واپسی کا فی الحال کوئی ارادہ نہیں رکھتا تھا۔ گزشتہ کافی دنوں سے اس کی سرگرمیاں بھی بڑی حد تک پر اسرار ہوگئی تھیں یا کم از کم اماں زیتوبیہ کو ایسا ہی لگتا تھا۔ اس کے ہر دفعہ رات گئے گھر واپس آنے پر بابا زلاری کی نظروں سے ایک ہی سوال عیاں ہوتا تھا۔

"تو ہو گئی تسلی؟"

اور شہرام کی آنکھوں میں دہکتے خونی گلابوں کو دیکھتے

ہوئے انہیں جیسے خود ہی جواب مل جاتا تھا۔
"نہیں.... ابھی نہیں.... ورنہ ان روشن آنکھوں سے جھلکتی بدلے کی آگ بجھ چکی ہوتی۔"
ان دس دنوں میں وہ رات دن سیرین کے گھر کے باہر پہرہ دیتا رہا تھا۔
دروازے کے بند کواڑ آج بھی اس کی نظروں کے سامنے تھے۔ ان دس دنوں میں نہ تو کوئی وہاں اپنے نقب کی یاد تازہ کرنے آیا تھا اور نہ ہی سیرین کسی سے ملنے کہیں باہر گئی تھیں۔ شہرام کو اب بے زاری ہونے لگی تھی۔ لیکن اسے اپنے دل کی بے چینی کو ختم کرنے کے لیے مستقل مزاجی سے کام لینا تھا۔
ہوا کی خنکی اس کے بھاری کوٹ کی نہ جانے کس درز سے اندر آ کر اسے سن کر رہی تھی۔ اس کے اس کوٹ کی اندرونی جیب کے اندر صیقل کیا ہوا خنجر بھی موجود تھا جس کی ٹھنڈی سطح پر شہرام کے ہاتھ بار بار ٹکراتے تھے۔
اس کے شکوک و شبہات بھی کچھ کچھ اس خنجر کی طرح ہی ٹھنڈے ہو گئے تھے۔ وہ سوچنے لگا تھا کہ شاید سیرین کی زندگی میں کوئی نہ ہو اور اس نے اپنی ہی کسی ذہنی سوچ کے تحت شہرام کو چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا ہو۔
شہرام نے سر اٹھا کر چاند کو دیکھا.... چاند اور اس کا سر اوس سے تر تھا چودھویں کا چاند صنوبر کے درختوں کی کالی بھیانک شاخوں سے جھلکتا پوری آب و تاب سے چمک رہا تھا۔ اوس اور خنکی کے باعث اس پر غنودگی اور تھکن طاری ہونے لگی تھی۔ وہ اس کھیل سے تنگ آنے لگا تھا۔
طامیر نے اسے صرف اتنا ہی بتایا تھا کہ وہ جو کوئی بھی ہے رات کے اندھیرے میں سیرین سے ملنے آتا ہے۔ اور وہ سام (زہر دینے والا) ان دس دنوں میں ایک بار بھی نہیں آیا تھا۔
شہرام آج رات بھی ناکام و نامراد ہو کر واپس گھر جانے کے ارادے باندھنے لگا تھا۔ تب ہی دو عمل ایک ساتھ ہوئے تھے۔
چاند گرہن کے شکم میں داخل ہونے لگا تھا۔
اور دلکی چال سے آتے سرسراتے قدموں کی چاپ شہرام کے کانوں میں پڑنے لگی تھی۔
خشک گھاس اور اکڑے پتوں سے ڈھکی پگڈنڈی پر کوئی بڑے سبک سبک کر قدم رکھ رہا تھا۔ اور مردہ پتے ایک چور کی آمد کا اعلان چیخ چیخ کر کر رہے تھے۔ شاید وہ سوکھے پتے مر کر بھی ارجیر کی پرامن سرزمین سے باوفا تھے۔ اور اس نقب زنی کی واردات کے کسی صورت طرف دار نہیں بن پا رہے تھے۔
شہرام کو ایک ایک پیڑ چلاتے ہوئے محسوس ہوا۔ درختوں، شاخوں، پتھروں، پانی کے قطروں پر کسی نے جیسے اسے اشارہ دیا۔ "وہ آ رہا ہے.... وہ، تمہارا مجرم...!"
پھر رفتہ رفتہ قدموں کی سرسراہٹ قریب آنے لگی۔ اندھیرے سے نتھرا ایک انسانی ہیولا اسے دکھائی دیا۔
گرہن رفتہ رفتہ بڑھنے لگا تھا وہ انسانی ہیولا شہرام کی نظروں کے مدمقابل سیرین کے گھر کے دروازے کے سامنے تک گیا۔ شہرام نے اپنے جسم کا بال بال کھڑا ہوتا ہوا محسوس کیا تھا۔
شجر صفت گھرے سائے نے بند چوبی دروازے پر دستک دی تھی۔ ایک، دو.... تین بار.... خاص انداز سے....
کوٹ کے اندر موجود خنجر پر شہرام کی گرفت مضبوط ہو گئی۔ لیکن اس کا دل کسی صورت مضبوط نہیں ہو تا تھا۔
گرہن مکمل ہو گیا اور سیرین کے گھر کا دروازہ کھل گیا۔
دو انسانی جسم جن میں ایک مرد تھا اور دوسری عورت، چند لمحے ایک دوجے کو دیکھتے رہنے کے بعد کل دار گڈوں کی طرح ایک دوجے سے دیوانہ وار لپٹے تھے۔
شہرام کو اپنا سانس درست کرنے میں جیسے ایک صدی بیت گئی تھی۔ سیرین اکیلی نہیں رہی تھی اس کی زندگی میں واقعی کوئی اور آ چکا تھا۔ اس بات پر ایمان

لے آنے کے بعد یک لخت شہرام کے دل کی دھڑکنیں ادھر ادھر بکھر گئیں۔

اس کی محبت پانی پر لکھی تحریر تھی اس سوچ نے اسے زخمی کردیا۔

دروازے کے پار صحن کے اندر ایک قندیل جل رہی تھی جس کی مدھم گلابی روشنی پورے صحن میں پھیلی ہوئی تھی۔ سیرین پیچھے ہوتے ہوئے اس قندیل کے نیچے جاکھڑی ہوئی۔

اور شہرام آگے ہوتے ہوئے ایک بڑے پتھر پر چڑھ گیا۔ نقب زن نے اپنے سیاہ کوٹ کا کالر گردن سے اوپر اٹھا رکھا تھا وہ اس کی شکل نہیں دیکھ پا رہا تھا۔

دونوں قندیل کے نیچے کھڑے تھے۔ وہ دونوں کیا کر رہے تھے اس میں دو رائے قائم کرنے کی گنجائش باقی نہیں رہی تھی۔ مدہم گلابی روشنی یہ منظر بڑی وضاحت سے دکھا رہی تھی۔

دونوں جو آپس میں گم تھے... رکے... چند القابات کہے گئے اور پھر ایسے گم ہو گئے جیسے ناگ اور ناگن بہار میں ہوتے ہیں۔ ایک ہوک شہرام نے اپنے دل میں اٹھتی محسوس کی۔

چودھویں کا روشن چاند رفتہ رفتہ گرہن کے ظرف سے باہر جھلکنے لگا تھا۔ قندیل کی روشنی اور خنجر کی سطح سرد تر ہو چکی تھی۔

پھر اونچے کالر کے کوٹ والا تاریک انسانی ہیولا گھوما تھا۔ اب سیرین کی پشت شہرام کی طرف تھی اور اس آدمی کا چہرہ شہرام کے روبرو... لیکن دور... بڑے توقف اور دل کی تسکین کے بعد کالر والا سر اوپر کو اٹھا تھا... اور دودھیا روشنی نے اس چہرے کو منعکس کیا تھا۔

اور پھر دو عمل ایک ساتھ ہوئے تھے۔

درد کا ایک گولا تھا جو شہرام کے اندر پھٹا تھا اور اس کے پیروں کے نیچے موجود پتھر سرک گیا تھا شہرام پھسل کر منہ کے بل گرا تھا۔

وہ نقب زن... سام... اس کا مجرم... اس کے حق پر ڈاکا ڈالنے والا... وہ کوئی اور نہیں تھا وہ حسنی تھا...

ولائی حسنی زلادی... شہرام کا سگا بھائی۔

شہرام کے دل نے کسی بارودی سرنگ کی طرح پھٹنا شروع کردیا' چاند ایک بار پھر گہنانے لگا ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اور اس رات میں اسقاط ہوا... ان گنت روشنیوں کا۔

☼ ☼ ☼

حیفہ مام کو تہہ خانے سے باہر نکال لیا گیا تھا۔

بیانکا نے دستخط کردیے تھے۔ جہاں جہاں ان کو درکار تھے۔ فی الحال اس کے ذہن میں حیفہ مام کی سلامتی سے زیادہ بڑھ کر اور کوئی چیز نہیں تھی... دستخط لینے کے بعد وہ لوگ کسی بھی طرح کے علاج سے مکر بھی سکتے تھے ان سے یہ امید زیادہ عبث نہیں تھی' لیکن بیانکا کو اب یہ جوا کھیلنا تھا... پوری طرح سے... اپنا سب کچھ داؤ پر لگا کر... اور اس نے اپنا سب کچھ داؤ پر لگا دیا... حیفہ مام کی کی گئی تاکید اور نصیحت کی پروا کیے بغیر... ان کی التجا کو نظرانداز کرکے۔

تہہ خانے سے باہر نکلنے کے بعد حیفہ مام کہاں تھیں۔ یہ بیانکا نہیں جانتی تھی۔ ان کا علاج ہو رہا تھا۔ اس بات کا بھی اسے صرف اندازہ ہی تھا۔ وہ بدستور اسی تہہ خانے میں بند تھی۔ جائیداد منتقلی کے سارے عمل تک اسے یہاں ہی رہنا تھا۔

اس کے بے حد اصرار پر ان سات دنوں میں صرف دوبار سیل فون پر اس کی بات حیفہ مام سے کروائی گئی تھی۔ کمزوری حیفہ مام کی آواز سے جھلکتی تھی' تاہم انہوں نے بیانکا کو تسلی دی تھی کہ ان کا علاج ہو رہا ہے۔ کہاں ہو رہا ہے' یہ بات وہ نہ بتا سکی تھی۔ بیانکا کو حیرت تھی کہ حیفہ مام جہاں بھی ہیں' آخر خود کسی طرح سے باہر نکلنے کی کوشش کیوں نہیں کر رہیں۔

اس کی سوچ کمزور تھی۔

جو لوگ انہیں قید کرنے کے لیے دنوں یا شاید مہینوں منصوبے بناتے رہے تھے' وہ کیا حیفہ مام کو کسی بڑے ہسپتال لے گئے ہوں گے؟ تاکہ ان کی ساری محنت' ساری چال بازی پر پانی پھر جائے۔ پھر ایک خیال

اچانک سے بیانکا کے دماغ میں آیا۔

"احمد میڈیکل کا اسٹوڈنٹ ہے۔"

تو کیا مام کا علاج اوپر کے ہی کسی کمرے میں ہو رہا ہے۔ ایک نا تجربہ کار اور شیطان صفت انسان کے ہاتھوں۔۔۔؟

یہ سوچ کر ہی بیانکا کا سر گھومنے لگا۔

لیکن اس چیز نے اسے اطمینان دلائے رکھا کہ کالے اور سرخ سرکل میں ایک خانہ ہرے رنگ کا بھی ہوتا ہے۔ جو زیادہ تر جواریوں کی نظروں سے چھپا ہی رہتا ہے۔

ابھی صرف کاغذات پر دستخط ہوئے تھے بہت سے آسان مراحل کے ساتھ ساتھ یونین کے آفس میں بذات خود بیانکا کی ظاہری حاضری کا مشکل ترین مرحلہ ابھی آنے والا تھا۔

بیانکا اس ایک دن کے لیے دن رات ایک کرنے والی تھی۔۔۔ یہ لوگ شاطر تھے بلاشک وشبہ۔۔۔ لیکن دریا کی گہرائی کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔۔۔ بیانکا اس حد سے آگے جاکر سوچنے لگی تھی۔

ان لوگوں نے وہاں کے کتنے لوگوں کو خرید لیا ہو گا۔۔۔ دولت نے اپنی کس حد تک طاقت دکھائی ہو گی۔۔۔ پانچ لوگ۔۔۔ دس لوگ۔۔۔ پورا عملہ۔۔۔ یونین کا پورا آفس۔۔۔ لیکن سڑکوں، دوکانوں پر پھرنے والے ہزاروں لوگوں کو تو یہ نہیں خرید سکتے ناں۔۔۔ تو پھر یہ مجھے مدد کے لیے پکارنے سے کیسے روک پائیں گے۔

بیانکا نے اپنی ہی ہنسی دبائی تھی۔

اس نے سوچ رکھا تھا کہ اس گھر سے باہر نکلنے کے بعد جیسے ہی خود کو رش میں محسوس کرے گی چیخ چیخ کر لوگوں کو اکٹھا کرے گی۔ تب ان لوگوں کے پاس موت کے علاوہ بچنے کا اور کوئی راستہ باقی نہیں بچے گا۔

یہ لوگ مجھے مام کی جان کی حفاظت کی دھمکی دے کر وہاں لے جائیں گے۔ میں ان کو ان کی ہی دھمکی پورا کرنے کا وقت نہیں دوں گی۔

وہ ہر روز اپنے اس خیال کو مزید سے مزید پختہ کر رہی تھی اپنے اس خیال میں موجود مختلف ممکن خامیاں دور کرنے کی کوشش کر رہی تھی اگر ایسا ہو گیا تو؟ اگر انہوں نے ویسا کر لیا تو۔۔۔؟ یہ لوگ بکتر بند گاڑی کا انتظام تو کرنے سے رہے۔۔۔ اور میرے منہ پر کپڑا باندھنے یا ٹیپ لگانے سے بھی۔۔۔ وہ ہر سوچ ہر زاویے پر غور کر چکی تھی اور ہر مسئلہ کا مکمل حل نکال چکی تھی۔

یہ لوگ نہیں جانتے کہ مجھے یونین کے آفس لے جا کر یہ اپنی زندگی کی کتنی بھیانک غلطی کرنے والے ہیں۔ یہ لوگ وہاں اپنی موت کو دعوت دینے جا رہے ہیں۔

تصور ہی تصور میں اس نے خود کو چلاتے پایا۔ پھر لوگوں کو اور سیکیورٹی گارڈز کو اپنی طرف بڑھتے لوگوں کو، احمد، غفار تایا کا گھیرا تنگ کرتے۔ پولیس کو آتے اور ان باغیوں کو پولیس وین میں بند ہوتے۔ یہ خیال خوش کن تھا۔ اس کا سیروں خون بڑھ گیا۔

وہ سوچنے لگی کہ ان پر کون کون سی دفعات لگ سکتی ہیں۔

حبس بے جا، تشدد، ظلم، اغوا، قتل، جائیداد کی غیر قانونی منتقلی جعلی اقرار نامہ۔

پھر وہ سوچنے لگی کہ ان لوگوں کو کس کس طرح کی سزائیں مل سکتی ہیں۔ سزائے موت، الیکٹرک چیئر، زہر کا انجکشن، پندرہ سال قید۔۔۔ شعبہ زراعت کی طرف سے ملا یہ گھر، نوکریاں، احمد کا میڈیکل کیریر۔۔۔ یہ لوگ پاکستان واپس جانے کے بند ہو چکے راستے کھوجتے پھریں گے۔

بیانکا کی ایک چیخ سب ختم کر دے گی۔ یہ لوگ ڈی پورٹ ہونے کی التجائیں کریں گے۔

اسے ہنسی آئی تھی کہ یہ لوگ کاغذ کے ایک پرزے پر دستخط کروا کر کتنے مطمئن ہو چکے ہیں اور اسے خود پر بھی غصہ آیا تھا اس نے کیوں اتنے دنوں اس کام کو لٹکائے رکھا بھلا اصل کام تو یونین کے آفس میں ہی ہونا تھا اور اب تو واقعی اصل کام یونین کے آفس میں ہی ہو گا۔

جب سارے پانسے بیانکا کے حق میں جائیں گے۔

تہہ خانے میں بھی کافی تبدیلیاں ہو چکی تھیں۔
اس کے لیے ایک بیڈ لگا دیا گیا تھا مزید لحاف فراہم کیے گئے تھے اور ایک برقی گرمالے (ہیٹر) کا بھی انتظام کر دیا گیا تھا۔ کھانا بھی پہلے کی نسبت بہتر آنے لگا تھا۔ اگر ان چیزوں کا انتظام نہ بھی کیا جاتا تو جو کچھ وہ ان دنوں سوچ رہی تھی وہ اس کے ہر طرح کے آرام اور ذہنی سکون کے لیے کافی تھا۔
وہ بے چینی سے ایک ایک دن گن گن کر گزار رہی تھی۔ چھٹیوں کے بعد کے پہلے ورکنگ ڈے اسے آفس میں حاضر ہونا تھا اور.... اور اس دن....
اس نے اپنے بلند بانگ قہقہوں کو بمشکل دبایا کہ کہیں وہ پاگل ہی نہ ہو جائے۔ پانچوں نفرت انگیز چہروں پر اسے ترس آیا تھا۔ جو عنقریب بیانکا سے رحم کی اپیل کریں گے۔
پیپر آنے میں مزید دس دن درکار تھے اور یہ دس دن اس نے خوش خوش گزارنا تھے۔

☼ ☼ ☼

پہاڑوں کی تلچھٹ میں کسی سنگ آہن دبا کا ظہور ہوا تھا۔ اس آہن کی کشش قیامت خیز تھی۔ جو شہرام کے پورے وجود سے لپٹ کر اس کو اپنی اور کھینچ رہی تھی۔
وہ نیچے کی اور سرکتا جا رہا تھا تیز تیز.... تیز تیز....
چاند نے اپنی روشنی بڑھائی تھی کہ اگر اسے ٹھوکر لگی تو بڑی جان لیوا ثابت ہو گی۔
لیکن شہرام کو کسی چیز کی پروا نہیں تھی۔ نوکیلے پتھروں نے اس کے جوتے پھاڑ دیے تھے۔ اس کے ہاتھ جھاڑیاں پرے کرتے کرتے چھل گئے تھے۔ گہری تاریکی اور چاند کی اعلیٰ ظرفی کے باوجود بھی اسے راستے نظر نہیں آتے تھے سوائے ایک راستے کے جو پاتال کی طرف جاتا تھا۔
"تم ہونہار تھے.... مجھے افسوس ہوا کہ تم بھی فریبی جذبوں کے پجاری نکلے۔" اسے بابا زلاری کی بات یاد آئی تھی۔

آنسوؤں کی نم لکیر جو اس کے دونوں گالوں پر ایک بار پھر نئے سرے سے گیلی ہونے لگی تھی۔
"کیا تم اتنے بہادر ہو؟"
اس کا سانس.... ہر سانس اس کے منہ سے کسی سسکی کی طرح بر آمد ہونے لگا تھا۔
"پھر تو میں بھی تمہاری بے خوفی کو دیکھنا چاہوں گا۔ تمہاری ہمت اور جرات کو پرکھنا چاہوں گا۔"
وہ سرکتا جا رہا تھا۔ نیچے کی اور.... کسی بے وزن شے کی طرح.... کسی بے روح جسم کی طرح۔
"کسی اپنے پیارے کے سینے میں خنجر اتارنے کے لیے ہمارا جنون صرف چند لمحوں کا ہی ہوتا ہے۔"
"بابا آپ سب جانتے تھے آپ نے اس ادھورے راز کو میرے دل میں صیقل ہوئے خنجر کی طرح اتارا ہے۔"
وہ میلوں کا سفر طے کر چکا تھا لیکن تھکا نہیں تھا۔
زنگی ہٹر (کالی بلبل) کی پراسرار رینی تھی جو زغالی (بے جلے کوئلہ والی) رات کے ذروں پر اپنی بو پھونکتی تھی.... یہ تو گرمی حیات سے لرزاں تھی.... بے وزن.... لیکن خوفناک بھی۔
اور پھر اچانک وہ رک گیا۔
سنگ آہن دبا نے اپنی کشش روک لی۔
اس کی آنکھوں کے آگے کدام کا ایک گھنا اور.... سایہ دار درخت تھا۔ ایک فسوں خیز درخت.... جس کی ایک پر جاتی برگد سے ملتی ہے۔
برگد.... راجہ گدھ کا استعارہ۔
اور "پہال ساز" کا پیامبر۔
شہرام ایک ٹک اس شاخ کو دیکھنے لگا جو انسانی ہاتھوں سے کندہ ہو چکی تھی۔ گلاب کے پھول کے ساتھ لالے کا بے ڈھنگا پھول.... جیسے اس پر ہنس رہا تھا۔ اپنی جیت پر خوش تھا اور اس کی ہنسی میں ہتک تھی۔
"تم انہیں قتل کرنا چاہتے ہو.... جو لفظ تمہیں اتنی شرم دلا رہا ہے۔ وہ عمل تم کیوں کر کر گزرو گے؟"
کوٹ کی اندرونی جیب سے اس نے ٹھنڈی سطح والا

تازہ صیقل کیا ہوا خنجر نکالا تھا۔ صدیوں پرانے خنجر کو۔۔۔۔ جب کسی روز ڈوبتے سورج نے اس خنجر کے وار کو دیکھا اور سہا ہوگا۔

پھر یک لخت شہرام نے وہ خنجر کدام کے پیڑ کی شاخ پر مرتسم لالے کے پھول کے عقب میں اتار دیا تھا' پھول کی استہزائیہ مسکراہٹ لمحے بھر میں بگڑ گئی تھی۔

پتا نہیں یہ اس کے ہاتھوں کی لرزش تھی یا اسے "سان" پر صیقل ہوئے خنجر کا وار کرنا ہی نہ آیا تھا کہ خنجر کی تیز دھار لالے کے پھول کو چیرتی ہوئی فاصلے پر نقش گلاب کے پھول کی ایک پتی سے ٹکرائی تھی اور شاخ سے پھوٹتی حقیقت سے بھیانک حد تک قریب گلاب کے پھول کی ایک پتی مسخ ہو گئی تھی۔

شہرام ٹکٹکی باندھے اس مسخ پتی کو گھورنے لگا۔ جمع اوس کا ایک قطرہ اس پتی سے ٹپکا تھا۔

شہرام کی آنکھیں پھیل گئیں۔

اس قطرے کا رنگ سرخ تھا۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے سرخ خون جیسے قطروں کے بہنے کی رفتار متواتر ہوتی چلی گئی۔

☆ ☆ ☆

سارا آسمان سلوٹ زدہ تھا گویا ریشم کے نیلے تھان کو کسی نے بلوری مرتبان میں بھر دیا ہو۔

بڑے دھندلے' انجان اور عجیب و غریب مناظر تھے جو ایک کے بعد ایک آتے چلے جا رہے تھے۔

جنہیں دیکھتے دیکھتے اس کی آنکھیں تھک گئی تھیں۔ پتا نہیں کیوں آج صبح سے ہی اس کی آنکھیں درد کر رہی تھیں جیسے ان میں کوٹ کوٹ کر نیند بھر دی گئی ہو اور وہ سونے کی عادت کو ترک کر چکی ہو یا مدتوں سے بھولی بیٹھی ہو۔

اس نے اپنے کوٹ کی جیبوں میں ہاتھ دے لیے تھے۔ یہ صورت حال بھی عجیب تھی۔ جسے وہ سمجھ نہیں پا رہی تھی صبح سے ہی اسے سردی بھی کافی محسوس ہو رہی تھی۔

شاید وہ اس طرح کے موسم کے لیے ناکافی لباس میں تھی۔

اس کے پاس تایا غفار بیٹھے ہوئے تھے آگے احمد اور چچا جلال۔

وہ پیر کا دن تھا یونین کے آفس میں جانے کا دن۔

آنکھیں مسل مسل کر اس نے کچھ یاد کرنے کی کوشش کی تھی۔

"ہم یونین کے آفس میں جا رہے ہیں ناں۔۔۔۔ ہاں ڈیڈ کے اٹارنی بھی ہوں گے۔"

اس نے ایک بار پھر کمزور آواز میں تصدیق چاہی تھی۔ احمد نے ڈرائیونگ کرتے بیک ویو مرر سے اسے دیکھا تھا۔ اور تایا غفار نے ناگواری سے ہاں میں سر ہلایا تھا۔

اپنی بات کی تصدیق پر اس نے ایک بار پھر ذہن پر زور ڈالا اور یاد کرنے کی لاحاصل کوشش کی کہ اسے آج کے دن کا اتنی شدت سے انتظار کیوں تھا؟ وہ اس دن کے لیے ایک ایک دن کیوں گن رہی تھی۔

لیکن یہ بات بارہا یاد کرنے کے باوجود بھی اسے ٹھیک سے یاد نہیں آ پا رہی تھی۔

دو گھنٹے کے تمام سفر کے دوران میں وہ تقریباً" ایک گھنٹہ یہ ہی کچھ سوچتی رہی تھی' آج اس کے پیٹ میں بھی درد ہو رہا تھا شاید اس نے آج باہر آ کر اپنے لیے دوائی لینی تھی یا شاید تایا غفار اسے حیفہ مام سے ملوانے لے کر جا رہے تھے۔۔۔۔ سارے خیالات آپس میں گڈمڈ ہو رہے تھے۔

سفر جیسے صدیوں بعد ختم ہوا تھا۔

گاڑی میں سے باہر نکل کر اس نے دیکھا۔ مختلف دوکانیں اور اسٹالز تھے۔ جن کے بیچوں و بیچ وہ کھڑی تھی۔ بہت سے لوگ تھے۔ بہت رش تھا جو اس کے اطراف میں چاروں طرف پھیلا ہوا تھا۔

ہاں کچھ کچھ ایسا ہی منظر اس نے سوچا تھا۔ دیکھا تھا آزمایا تھا لیکن کہاں؟ کب؟ وہ یاد نہ کر پائی۔

ساری یادداشتوں اور خیالات کو مجتمع کر کے اس نے اپنے قریب سے گزرتے ایک لڑکے کو پکارا تھا۔ اسے شاید کچھ ایسا ہی کرنا تھا۔

"جی میں آپ کی کیا مدد کر سکتا ہوں۔"

اجنبی اسے اجنبی نظروں سے دیکھتے ہوئے دوبارہ پوچھ رہا تھا۔ اور بیانکا کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا اس نے اس لڑکے کو آخر کیوں روکا ہے۔ لڑکا کندھے اچکا کر آگے بڑھ گیا۔ تایا غفار سمیت سب ہی کار میں سے نکل کر اس کے پاس آگئے۔ چچا جلال نے اسے کسی مریض کی طرح پکڑ لیا۔ وہ واقعی گرنے والی تھی۔ ذہن پر کوئی دباؤ تھا شاید....

اندر آفس میں سیٹ پر بیٹھ کر اسے کچھ سکون محسوس ہوا تھا۔ اگرچہ تب بھی وہ تذبذب کے عالم سے ہی گزر رہی تھی کہ اس نے سڑک پر اس لڑکے کو روکا کس وجہ سے تھا۔ شاید کوئی ضروری کام تھا۔ جسے وہ اچانک بھول گئی تھی۔

کچھ سوالات ہوئے تھے جنہیں چچا جلال نے زور دار آواز میں دہرا کر بیانکا کو سمجھایا تھا۔ ڈیڈ الیاس کے اٹارنی (جو اب اس کا بھی اٹارنی تھا) نے بھی اس سے بعض معاملات کی تصدیق چاہی تھی۔ اس کے چہرے پر بڑی زہر خند سی مسکراہٹ تھی' بیانکا کو اس حالت میں بھی نہ جانے کیوں اس مسکراہٹ سے نفرت سی محسوس ہوئی تھی۔

اس کی جو سمجھ میں آیا وہ جواب دیتی گئی۔

پھر یونین کے ایک کارندے نے اس کے آگے ایک فائل کی تھی اور اسے انگلی رکھ کر سائن کرنے کو کہا تھا۔

اس نے قلم پکڑ لیا لیکن وہ کچھ لکھ نہ سکی۔

اسے سائن کرنے سے پہلے کچھ کرنا تھا' سائن کرنے تک کی تو نوبت ہی نہیں آئی تھی "آر یو آل رائٹ (کیا آپ ٹھیک ہیں؟)"

اس سے پوچھا گیا تھا۔

"جی...." اس نے بردبار لڑکی کی طرح جواب دیا تھا۔ اور آگے جھک کر ایک کاغذ پر سائن کر دیے تھے۔ صفحہ پلٹا گیا تھا اور دوسری طرف بھی سائن کرنے کو کہا گیا تھا۔

یقیناً" کسی اچانک ہوئے دھماکے کی طرح اسے یاد آیا تھا کہ اسے چلانا تھا.... بے تحاشا۔

لیکن اسے ایسا کیوں کرنا تھا بہت چاہ کر بھی یہ بات اسے یاد نہ آسکی۔

اگر اس نے یہاں چیخ ماری تو کہیں یہ لوگ اسے پاگل ہی نہ سمجھ لیں' کوئی پڑھی لکھی لڑکی بھلا ایسا کیسے کر سکتی ہے۔ ایک آفس میں بیٹھ کر یوں چیخنا چلانا اور جب کہ کوئی بات بھی نہ ہوئی ہو۔

اس نے دوسرے صفحے پر بھی سائن کر دیے۔ پھر تیسرے پر بھی۔

باقی کے آدھے گھنٹے کے دوران بھی وہ خود کو لعنت ملامت کرتی رہی تھی کہ آج کل وہ نہ جانے کیا کیا سوچنے اور منصوبے بنانے لگی ہے۔ اگر جلد ہی اس نے اپنی ذہنی حالت کو اپنے کنٹرول میں نہ لیا تو وہ پاگل بھی ہو سکتی ہے۔

وہ ایک بار پھر باہر آئی تھی اور تب ہی اسے یاد آرہا تھا کہ اسے سارے چلتے پھرتے لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرنا ہے۔ اپنے پاس بلانا ہے۔ اپنے اوپر ہو رہے ظلم کے بارے میں بتانا ہے۔

اس نے بے تحاشا شعوری جدوجہد کے بعد چیخنا چاہا تھا' لیکن اس کی چیخ کسی بڑبڑاہٹ سے زیادہ نہیں تھی۔

وہ واپس کار میں بٹھا دی گئی۔ سفر شروع ہوا ایک بار پھر سے.... اور وہ لوٹ آئی.... اپنے مدفن' اپنے مسکن' تہہ خانے میں اسی طرح پریشان اور ہر چیز بھولی ہوئی کہ جس طرح مجسم یہاں سے گئی تھی۔

رات کی تاریکی جوں جوں بڑھتی گئی اس کو دی گئی دوائی کا اثر زائل ہوتا گیا۔ سارے واقعات آہستہ آہستہ اسے یاد آئے تھے۔

اسے یاد آیا کہ صبح وہ آنے والے وقت کو لے کر بہت خوش تھی اور اسی خوشی میں اس نے صبح کا ناشتہ اور کل رات کا کھانا بھی خوب دل لگا کر کھایا تھا۔ ناشتہ بھی معمول سے ہٹ کر اور مزے کا تھا۔ وہ خوش نہ بھی ہوتی تو نہ جانے کتنا کھا جاتی۔

پھر آگے کیا ہوا۔

پھر یہ ہوا کہ اس نے اپنا سب کچھ کھو دیا۔

آدھی رات کے بعد جب اس کے اعصاب پوری طرح جاگ گئے تو اس کے آنسو بھی خود بخود ہی جاری ہو گئے۔

"میں نے سب کچھ کھو دیا ڈیڈ.... مجھ سے میرا سب کچھ چھین لیا گیا مام۔"

وہ بڑی دیر تک بے آواز روتی رہی تھی اور آنسو اس کا چہرہ بھگوتے رہے تھے۔ اس نے دل ہی دل میں احمد کی تعلیمی قابلیت کی داد دی تھی۔ وہ واقعی ایک ماہر ڈاکٹر بننے والا تھا۔ اس کا علم کامل تھا۔

☆ ☆ ☆

دو چراغ سی اٹی فضا میں گم وہ ایک ٹیڑھی بل کھاتی ڈھلوانی سڑک کے عین بیچ و بیچ بیٹھا تھا۔

اس کے رونے کی آواز اس قدر اونچی تھی کہ گیدڑوں کے غول کے غول اس آواز کے بھیانک پن کو سن کر دہشت سے چنگھاڑتے ہوئے ایک دوجے کو کسی انجانے خطرے سے خبردار کر رہے تھے۔

دور ایک ٹرک تیز رفتاری سے آتا ہوا۔ ہارن دیتا ہوا شہرام کے قریب بڑھتا چلا آ رہا تھا اس وزنی ٹرک کی دھمک اتنی دور سے بھی شہرام کے وجود کے نیچے تھرتھراہٹ پیدا کر رہی تھی۔

ہارن گیدڑوں کی چنگھاڑ اور شہرام کے رونے کی آواز نے فضا پر بڑا دہشت ناک ماحول طاری کر دیا تھا۔

پھر ہارن کی آواز میں انجن کی آواز بھی شامل ہو گئی جو رفتہ رفتہ قریب آتی جا رہی تھی.... وہ وہاں سے نہیں اٹھا تھا۔

"اور اگر پھر بھی تم مطمئن نہ ہوئے تو؟" بابا زلاری نے اسٹور میں اس سے پوچھا تھا جب وہ سان پر خنجر تیز کر رہا تھا۔

"تو میں خود کو ختم کر لوں گا۔" اسے اپنا جواب یاد آیا۔

"محبت میں سیاہ چوغہ پہن لینا آسان نہیں ہوتا.... یہ پہن بھی لو تو نبھانا مشکل ہو جاتا ہے۔"

اس نے وہاں سے نہ اٹھنے کا جیسے عزم کر لیا تھا۔

دائیں طرف سڑک بالکل گھوم کر گول دائرے کی صورت پیچھے کو جاتی تھی اور وہاں سے تیزی سے آتے کسی بھی شخص کو ساری صورت حال کا اندازہ تب ہی ہونا تھا جب تک سڑک کے درمیان بیٹھے شخص کی ہڈیاں چور چور ہو چکی ہوتی تھیں۔

وہ بیٹھا رہا اور گھٹنوں میں منہ دیے روتا رہا۔ وہ آخری بار رو رہا تھا۔

"تم اپنے کام سے کام رکھا کرو شہرام.... اپنی پڑھائی کا رعب مجھ پر ڈالنے کی کوشش مت کرنا۔" ولائی حسنی نے غصے سے کہا تھا۔ شہرام سن سا ہو گیا تھا اور اب دوبارہ یاد کر کے پتھر کا بن گیا تھا۔

"اب تم مجھے سکھاؤ گے اصول؟"

ولائی حسنی کو واقعی کوئی اصول سیکھنے کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ انہوں نے کمال کی بے اصولی جو کی تھی۔

"بدقسمتی میرے ساتھ تھی.... میں آزمائی گئی اور آزمائش میں پوری نہ اتر سکی، مجھے بہکنا تھا۔ میں بہک گئی۔" سیرین نے کتنی آسانی سے اپنی بے وفائی کے معاملے کو قدرت اور قسمت کا نام دے دیا تھا۔

"میری خوشی اب تمہارے ساتھ وابستہ نہیں ہے۔"

"وقت آنے پر تم جان جاؤ گے کہ وہ کون ہے۔"

شہرام جان گیا تھا اور یہ وقت کتنا برا تھا۔ اس کی آواز مزید اونچی ہو گئی تھی۔

تیتری نے اس آواز کو اپنی آواز پر غالب ہوتے دیکھا اور خاموش ہو گئی، صنوبر کے دیو قامت درخت اپنی شاخیں موڑ موڑ کر گردنیں جھکا جھکا کر اس گھٹڑی بنے جوان کو دیکھنے لگے۔

ٹرک اتنا قریب آ چکا تھا کہ اس کی روشنی بل کھاتی سڑک سے جھلک کر باہر کو لپکنے لگی تھی اور اندھیرے میں ڈوبے شہرام کا وجود واضح کرنے لگی تھی۔ وہ وہیں ساکت بیٹھا رہا۔

"کوئی کسی کے بغیر نہیں مرتا.... زندگی بہت ٹھوس

اور ڈھیٹ ہے۔ یہ ہر حالت میں گھسٹتی ہے۔"

"نہیں....." اس نے جیسے فیصلہ کر لیا تھا "اس زندگی کا اب کوئی فائدہ نہیں۔ وہ زندگی کے میدان میں پہلا کھیل، کھیل کر ہار چکا تھا اور یہ ہار ایسی تھی جس نے اسے مزید کسی کھیل کے قابل نہیں چھوڑا تھا۔ اس کی سانسیں اب ساری زندگی ہموار نہ ہونے والی تھیں۔ اس کا دل تڑپتے رہنے کو اپنا شعار بنانے والا تھا۔ ایسے میں اس نے جی کر کیا کرنا تھا۔"

ٹرک گھوم کر بالکل سامنے آ گیا تو وہ سر اٹھا کر اس کی تیز روشنی دیتی ہیڈ لائٹس کو دیکھنے لگا۔

بس چند لمحوں کی دوری اور پھر فنا ہو جانے کا ان چاہا ذائقہ..... شہرام نے آنکھیں بند کر لیں اور ان چند لمحوں کی دوری کو کسی نے بہت طویل کر دیا۔

دو مضبوط ہاتھوں نے اسے پکڑ کر اٹھایا تھا اور اوندھے منہ ڈھلوان پر لڑھکا دیا تھا۔

ٹرک گونجتا ہوا آگے نکل گیا۔ وہ تھوڑا سا لڑھک کر رک گیا تھا۔ لیکن اٹھا نہیں تھا ویسے ہی لیٹا رہا تھا' طامیر نے اسے گریبان سے پکڑ کر کھڑا کیا تھا۔

"تم پاگل تو نہیں ہو گئے؟" وہ چلایا تھا۔

جواب دینے کے لیے شہرام کے پاس کچھ نہیں تھا وہ پاگل ہوا نہیں تھا' بلکہ کر دیا گیا تھا۔

"میں سمجھا تھا کہ تم بہادر ہو گئے ہو..... تم تو بزدل بھی نہیں رہے۔" طامیر غصے سے دیوانہ ہو رہا تھا۔

"میں..... میں نہیں رہا....."

"اگر تمہیں کچھ ہو جاتا تو میرے پاس زندہ رہنے کا کوئی جواز باقی رہتا؟" وہ خود ہی نرم ہوا تھا۔ پھر اس نے شہرام کو ایک ٹیلے پر بٹھا دیا تھا۔

کافی دیر تک دونوں میں سے کوئی بھی نہیں بولا تھا۔

"تو تم نے جان لیا کہ وہ ولائی حسنی ہے۔" شہرام چونکا تھا۔

"تم..... تمہیں پہلے سے پتا تھا.....؟"

شہرام نے پوچھا تو طامیر نے نظریں جھکالی تھیں۔

"ہاں!" بہت دھیمی آواز میں طامیر نے کہا۔ جیسے چاہتا ہو کہ شہرام سن ہی نہ سکے..... شہرام نے سن لیا۔

لیکن اس نے کوئی شکوہ نہیں کیا تھا۔

"اور کیا کیا جانتے ہو؟"

"دونوں دو ماہ پہلے نکاح کر چکے ہیں اور سیرین حسنی کے بچے کی ماں بننے والی ہے۔"

طامیر نے اٹکے بغیر کہا تھا۔ اب کچھ بھی چھپانے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔

آروہی کی گرہیں جو صبح کی دھوپی جالی پر دوبارہ بندھنے کے لیے نیند سے جاگ کر اپنا بناؤ سنگھار کر رہی تھیں۔ ان ساری گرہیوں کو آن کی آن میں اجل کی ہواؤں نے آن گھیرا اور نوبت کے ٹوٹے ہوئے سر چاند کی لہروں میں گھل مل گئے۔

"وجہ بتا سکتے ہو؟" شہرام کی آواز دوسری دنیا کے پہاڑوں پر سے آتی محسوس ہوئی تھی۔

"ہاں..... سرکش اور منہ زور نفس.....!" طامیر کے پاس وجہ بتانے کے لیے اس سے بہتر الفاظ نہیں تھے۔

"بابا جانتے ہیں؟"

"ہاں..... صرف خالا زینت یہ بے خبر ہیں۔" شہرام کے چہرے پر کسی قسم کا کوئی رد عمل ظاہر نہیں ہوا تھا۔

"لیکن اب نہیں رہیں گی۔" شہرام اٹھ کھڑا ہوا۔ طامیر بھی اٹھا تھا۔

"کہاں جا رہے ہو؟" شہرام کے قدموں کی چاپ تیز ہو گئی تو طامیر نے پوچھا تھا۔

شہرام چلتے چلتے رکا اور طامیر کے چہرے کو ایسے دیکھنے لگا جیسے پہلی بار دیکھ رہا ہو۔

"وقت آ گیا ہے..... دوستی کا فرض ادا کرنے کا۔"

رات کی تاریکی میں شہرام کی آواز سناٹے کے ساتھ ساتھ خوف کی صورت سنائی دی۔ طامیر کا دل بیٹھنے لگا تھا۔ کچھ اس آواز سے..... کچھ اس کے گالوں پہ بہہ کر سوکھ چکی۔ آنسوؤں کی لکیر دیکھ کر.....

"تو پھر بولو....."

"میں روپوش ہونا چاہتا ہوں..... ہر ایک سے..... ہر اس شخص سے جسے میں جانتا ہوں..... چھپ جانا چاہتا ہوں..... اپنے آپ سے بھی..... تم سے بھی..... بابا..... اماں سے بھی..... ہمیشہ ہمیشہ کے لیے..... میری مدد کرو۔"

"بولو... کیا مدد چاہیے؟" طامیر اداسی سے بولا تھا۔

"مجھے کچھ پیسے چاہئیں۔ امریکا جانے کے لیے... اور گھر سے میرا پاسپورٹ... صرف پاسپورٹ... اور کچھ بھی نہیں۔"

شہرام نے کہا تو طامیر مزید افسردہ ہو گیا۔

☆ ☆ ☆

بھاگ بھری سرد دھوپ کا ایک کھوکھلا چوکھٹا تھا۔ جو بڑے ہال نما کمرے کے نیم اندھیرے میں اس کی نظروں کے سامنے تھا۔

دروازے کے دائیں بائیں اور اوپر تقریباً" ادھ فٹ شیشے کے فریموں میں سے آتی تیز دھوپ اس کی آنکھوں میں گھستی تھی۔ اسے اس چوکھٹے کے علاوہ اور کچھ بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ جلد سے جلد باہر نکل جانا چاہتی تھی۔ پر دروازے تک کا راستہ بہت لمبا اور پل صراط کی طرح تیز دھار تھا۔ اتنا کہ وہ ایک ایک قدم پر ایک ایک صدی جتنا سفر طے کر رہی تھی۔

اس کے بال بری طرح بکھرے ہوئے تھے اور اس کا جسم کسی دق زدہ مریض کی طرح کانپ رہا تھا۔ پرسوں دن سے آج صبح دہائی تک کے ان لمحات نے اس کے جسم کا سارا خون چوس لیا تھا اور وہ ایسی ہو گئی تھی جیسے شہد نکل جانے کے بعد خالی خولی کھوکھلا کھگا رہ جاتا ہے۔ سب کچھ ہار جانے اور کھو دینے کا غم اس قدر تباہ کن تھا کہ وہ اپنے آپ سے بھی نظریں نہیں ملا پا رہی تھی۔

یہ ان لوگوں کی باقی ماندہ شرافت اور رحم دلی تھی کہ وہ اسے سیدھے سبھاؤ گھر سے باہر کر رہے تھے۔

اس کے دائیں طرف شہناز اور فیروزہ کھڑی تھیں۔ بائیں طرف چچا جلال اور تایا غفار... وہ ان چاروں کے درمیان میں سے گزر رہی تھی۔ سامنے نظریں گاڑے ہوئے... ان چہروں سے اسے اتنی نفرت ہو چکی تھی کہ وہ ان کو اب آنے والی زندگی میں خواب میں بھی دیکھ لے تو دنوں نہ سو پائے۔

شہناز نے اسے حیفہ کی شال پکڑائی تھی۔ بیانکا نے دھوپ کے چوکھٹے پر نظریں گاڑے وہ شال تھام لی تھی۔

"ہمارا طریقہ کار غلط ہو سکتا ہے۔ لیکن اپنے حق کے معاملے میں ہمارا موقف بالکل درست تھا۔" چچا جلال نے اسے کہا تھا۔ اس نے جیسے سنا ہی نہیں۔ وہ سیدھ میں چلتی رہی۔ ان باتوں پر تکرار اب لاحاصل تھی۔ اس کا وجود کسی اجڑی زمین کی طرح ہو چکا تھا۔ ایسی زمین جس پر ایٹم بم پھٹ چکا ہو اور جس پر پھر سالوں شجر کاری نہ کی جا سکے۔

فیروزہ نے اسے دو ہینڈ بیگ پکڑائے تھے۔ ایک خود اس کا اور ایک حیفہ مام کا۔ اس نے دونوں ہینڈ بیگز تھام لیے تھے۔ کمزوری کی وجہ سے دونوں ہینڈ بیگز اس کے ہاتھ میں جھولنے لگے تھے۔

"باہر ٹیکسی کھڑی ہے۔ وہ تمہیں حیفہ تک لے جائے گی۔" غفار تایا نے کہا اور ساتھ ہی دروازے کا ہینڈل نیچے کو گھما دیا۔

اور مقفل دروازہ کھل گیا... لیکن بڑی دیر کے بعد...

تیز پیلی دھوپ کی برچھی اس کی آنکھ میں لگی تھی۔ وہ تیزی سے بھاگ جانے کے انداز میں باہر جانے کے بجائے ایک قدم پیچھے کو ہوئی تھی اور بے اختیار ہی اس نے آنکھوں کے اوپر ہاتھ رکھ لیے تھے۔ دھوپ بھی بڑی سازشی تھی۔ سب جانتی تھی اور جیسے بیانکا کے دشمنوں سے ہی جا ملی تھی۔

پھر آنکھوں کو آہستہ آہستہ دوبارہ کھولتے ہوئے وہ باہر کی طرف بڑھی تھی۔ اس کے پیچھے کھڑے وہ چاروں دروازے تک آ کر اسے باہر جاتے ہوئے دیکھنے لگے تھے۔

ٹیکسی کے پاس کھڑا احمد اسے باہر آتا دیکھ کر ڈرائیور سے کچھ کہتے کہتے رکا تھا۔ ڈرائیور نے اپنی سیٹ سے نیچے اتر کر اس کے لیے دروازہ کھولا تھا۔ وہ سیٹ پر بیٹھ گئی تو ڈرائیور نے دروازہ بند کر دیا تھا۔ احمد پرے ہٹ گیا تھا اور ٹیکسی چل پڑی تھی۔

سڑکوں پر معمول کا رش تھا۔ ہر طرح کے لوگ ہر

روز کی طرح چل پھر رہے تھے۔ کچھ سنجیدہ، کچھ خوش گوار موڈ میں، کچھ تاثرات سے عاری چہرہ لیے۔ بیانکا کا دل چاہا کہ وہ باہر نکل کر ان سب چلتے پھرتے لوگوں کے منہ پر چانٹے مارے اور ان سب سے کہے کہ وہ بھی اسی طرح روئیں جس طرح اس وقت اس کا دل رو رہا ہے۔ پتا نہیں سفر زیادہ لمبا تھا یا موسم نے بدلنے میں وقت نہ لیا۔

بھاگ بھری دھوپ کی لہریں اب کالے اودے بادلوں سے الجھ رہی تھیں۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے سارا ماحول گندم کی سنہری بالیوں کے رنگ میں ڈھلتا چلا گیا۔ مناظر کو واضح طور پر دیکھنے کے لیے بیانکا کو اپنی آنکھیں بار بار مسلنی پڑتی تھیں۔ ہوا میں ٹھنڈے جھونکے بھی شامل ہو چکے تھے۔

پھر ٹیکسی رک گئی.... ایک انجان جگہ پر....

ڈرائیور نے اتر کر پچھلا دروازہ کھول دیا۔ بیانکا کچھ نہ سمجھتے ہوئے باہر نکل آئی تھی۔ جس جگہ ٹیکسی رکی تھی، وہاں اسپتال تو دور کسی دو منزلہ بلڈنگ کا بھی نام و نشان نہیں تھا۔ وہ اجنبی نظروں سے اپنے اردگرد دیکھنے لگی۔ یہ جو بھی جگہ تھی بیانکا کے لیے نئی نہیں تھی۔ اس جگہ میں پہچان کی چھاپ ضرور دفن تھی۔ ذہن پر زور دینے کے باوجود بھی بیانکا کو یاد نہ آیا کہ وہ پہلے یہاں کیوں اور کب آئی تھی۔

ڈرائیور اپنی سیٹ پر واپس بیٹھ چکا تھا۔ پھر اس نے کھڑکی سے ہاتھ باہر نکال کر ایک تہ کیا ہوا کاغذ بیانکا کی طرف بڑھایا۔ کچھ نہ سمجھتے ہوئے بیانکا نے وہ کاغذ تھام لیا تھا۔

ٹیکسی ریورس ہوئی تھی اور پھر بیانکا کے دیکھتے ہی دیکھتے بہت دور نکل گئی تھی۔

کالے بادل کسی جلوس کی شکل میں اس کے سر کے اوپر آکر ڈھیریاں جمانے لگے تھے۔

جس وقت بیانکا نے وہ تہ شدہ کاغذ کھولا، تب تک اس پر بارش کی دو تین بوندیں گر چکی تھیں.... اور.... پھر اندر کی تحریر تو گویا "طوفان نوح" ہی لے آئی تھی۔

"ہم نے اپنی طرف سے بہت کوشش کی، لیکن خدا کو شاید ایسا ہی منظور تھا۔ الیاس کے دائیں طرف حیفہ کی قبر ہے۔"

ڈزن.... کی آواز کے ساتھ ساری دھرتی اس کے قدموں کے نیچے پھسلتی چلی گئی تھی اور کائنات کے سارے ستارے ٹوٹ کر اس کے اوپر آگرے تھے۔

☆ ☆ ☆

اس کا چہرہ گیلی زمردی گھاس کے قطعات کے اوپر کسی بے جان شے کی طرح پڑا تھا۔ اس نم گھاس میں سے گیلی بوئے گل کے بھبکے اٹھ رہے تھے۔ چوبیس گھنٹے اسی حالت میں پڑے رہنے کے باوجود اسے اس بو کی عادت نہیں ہوئی تھی۔ ہر آن بدلتی بو میں سے حیفہ مام کے وجود کی خوشبو اس کے وجود پر ایک نئی طرز سے حملہ آور ہوتی تھی۔ اس کے پاس نہ تلوار تھی۔ نہ میان اور نہ ہی ڈھال.... وہ نڈھال ہوتی رہی۔

ژالے ملی بارش نے زمین اور اس کے لباس کو بری طرح سے گیلا کر دیا تھا، اسے یاد آیا.... حیفہ مام کہا کرتی تھیں۔

"زندگی بہت چھوٹی، لیکن اس کے محسوسات بہت طویل ہیں.... نہ ختم ہونے والے.... صرف ایک بار نماز کسوف (سورج گرہن کے وقت پڑھی جانے والی نماز) پڑھ لینے سے زندگی کے اندھیرے روشنیوں میں نہیں بدلے جا سکتے.... یہ نماز کسوف تو زندگی کے ایک باب میں ہی نہ جانے کتنی بار آتی ہے.... تم تھکنا نہیں۔"

اسے زندگی کی نصیحت بھی کی گئی تھی تو کتنی تلخ.... وہ تھکی نہیں تھی۔ لیکن بے بس، بے ہمت اور نڈھال ضرور ہو گئی تھی۔ ضرورت سے زیادہ.... اور حیثیت سے بڑھ کر....

مٹی کی تازہ قبر پر لیٹے لیٹے روتے ہوئے وہ بارش کے باعث پوری طرح گیلی ہو گئی تھی۔ پھر شام ہونے لگی اور بارش رک گئی، وہ وہیں لیٹی رہی۔ اس کا غم بے کنار تھا۔

رات آئی اور اسے پتا بھی نہ چلا۔

صبح سے رات کا عالم ہی تو چل رہا تھا۔
وہ وہیں لیٹی رہی۔ دو آپس میں جڑی قبروں کے درمیان۔۔۔ جس میں سے ایک ڈیڈ الیاس کی تھی اور ایک حبیبہ مام کی۔۔۔ وہ خود ان دو قبروں کے درمیان تیسری قبر بن جانا چاہتی تھی۔
سخت اذیت والی رات سردی کی شدت سے پر تھی۔۔۔ لیکن اسے احساس تک نہ ہوا۔ وہ ہر احساس سے ماورا ہو چکی تھی۔
صبح ہوئی تو اس کے وجود کے ساتھ ساتھ زمین بھی خشک ہونے لگی۔ وہ کھلی آنکھوں سے ساکت لیٹی رہی۔ گیلی مٹی کے داغ جا بجا اس کے لباس پر مردہ کیچوؤں کی طرح چپکے ہوئے تھے۔
اسے اپنے وجود سے گھن آنے لگی تھی۔
وہ اس قدر بے حس و حرکت تھی کہ ننھی چیونٹیوں کی ایک لمبی لائن اس کے وجود سے ہو کر آگے گیلی قبر کے اندر دھنسی ہوئی مٹی کے اندر جا رہی تھی۔ وہ اس متحرک لائن کو دیکھتی رہی۔ بے روح بے نور آنکھوں کے ساتھ۔۔۔ دیکھتی رہی۔۔۔
اور سورج طلوع ہو گیا۔ اس کی شعاعوں میں کل صبح والی تیزی نہیں تھی' نہ جگا دینے' جلا دینے' جھلسا دینے اور نہ پگھلا دینے کی طاقت۔۔۔ اس کا سنسناتا دماغ ماؤف ہونے لگا تھا۔
خدا جانے زمین نیچے کی طرف کھسک گئی تھی یا بیانکا کی بینائی راتوں رات کمزور ہو گئی تھی کہ اپنے اوپر جھکتے ایک سائے کو بھی وہ نہ دیکھ سکی۔ نہ ہی اس کی آنکھیں کسی طرح کے تاثر کا اظہار کر سکیں۔
وہ سایہ لاٹھی ٹیکتا ہوا نیچے بیٹھا تھا۔ اس نے بیانکا کے ماتھے پر ہاتھ پھیر کر اس کے بالوں کو پرے کیا تھا اور اس ایک ذرا سے لمس میں ہی اس کے ہاتھ نے اس کے دہکتے وجود کے مرض کو جان لیا تھا۔
"اتنا تیز بخار۔۔۔" کانپتا ہوا بوڑھا رابن بڑبڑایا تھا۔
اس نے بیانکا کی سوختنی لکڑی جیسی آنکھوں میں جھانکا تھا۔ جہاں سے نخل مریم کی جڑیں باہر نکلی ہوئی لگتی تھیں۔

"مٹی کے ساتھ تب تک مٹی نہیں ہوا جا سکتا جب تک اوپر سے حکم نہ آ جائے۔" بوڑھے رابن نے پارہ زدہ انگریزی لہجے میں بڑے کام کی بات کی تھی۔" یہ تمہارا جو کوئی بھی تھا اس کا نعم البدل دنیا میں کوئی اور نہیں ہو سکتا۔ لیکن وقت کا تقاضا اور خدا کا حکم یہ ہی ہے کہ خود کو زندوں میں شمار رکھو۔"
بیانکا نے کچھ نہیں کہا تھا۔ اس نے کچھ سنا ہوتا تو یقیناً" کچھ کہتی۔
رابن نے اسے سہارا دے کر اٹھایا تھا۔
وہ اسے اپنے ساتھ اپنے گھر لے آیا تھا۔ دو منزلوں پر مشتمل وہ پرانی طرز تعمیر کا گھر آدھے سے زیادہ خالی تھا۔ اس گھر میں صرف دو افراد رابن اور اس کی بیوی کے علاوہ تیسرا کوئی جانور یا پرندہ بھی نہیں رہتا تھا۔
جس دن رابن بیانکا کو اپنے گھر لے کر گیا' اسی دن رات سے بیانکا کا علاج شروع ہو گیا تھا۔
بیانکا اپنا ذہنی توازن کھو چکی تھی۔

☆ ☆ ☆

"کہاں جاؤ گے؟" طامیر نے شہرام کو گھر سے اس کا پاسپورٹ لا دیا تھا اور اپنی حیثیت کے مطابق ایک بڑی رقم بھی زبردستی شہرام کے حوالے کر دی تھی۔
"امریکا۔۔۔"
شہرام دو دن کے بعد امریکا واپس آ گیا تھا۔
پتا نہیں اس وقت اس کی ذہنی حالت کسی طرح کے خطرے سے باہر تھی' یا خطرے کے اندر کہ وہ اپنی یونی ورسٹی اپنے اسپتال جانے کے بجائے نیویارک آ گیا تھا۔ کسی شناسا چہرے کا سامنا کرنے کی اس میں ہمت نہیں تھی' اور کسی اپنے کو ملنے کی اسے چاہ نہیں رہی تھی۔
طامیر کو رتی برابر بھی شبہ ہوتا کہ شہرام امریکا جا کر اس طرح بھٹکنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ تو وہ کسی صورت دوستی کا فرض سمجھ کر کیے گئے کام کو نہ کرتا اور نہ ہی شہرام کو ادھر سے باہر نکلنے دیتا۔۔۔ لیکن جو کچھ ہو گیا' وہ شہرام کے لیے بھی بلا ارادہ ہی تھا۔

جب رہبر رہزنوں سے مل جائیں تو قافلے والوں کا بھی وہ ہی حال ہوتا ہے، جو اس وقت شہرام کا تھا۔ مزید لٹنے کے لیے اس کے پاس کچھ بھی نہیں بچا تھا۔۔۔ لیکن لٹ چکے قافلے کو اتنا دکھ اپنے نقصان کا نہیں ہوتا، جتنا وسیع و عریض دنیا میں بے راستہ و بے منزل بھٹکنے کا خوف۔۔۔

وہ بھی بے راستہ و بے منزل ہو چکا تھا۔ لیکن بنا خوف زدہ ہوئے۔۔۔ سارا دن وہ آوارہ بادلوں کی طرح ادھر ادھر گھومتا رہتا بے مقصد۔۔۔ کبھی وہ گھنٹوں کسی پارک۔۔۔ بینچ یا بس اسٹاپ پر بیٹھے بیٹھے گزار دیتا۔۔۔ رات کے قیام کے لیے اسے زیادہ سوچ بچار نہیں کرنی پڑتی تھی۔ پارکوں، سڑک کنارے لگے بینچوں سے وہ آسانی سے رات بسر کرنے کا کام لیے جا رہا تھا۔ جو پیسے اس کے پاس تھے وہ بھی رفتہ رفتہ ختم ہونے لگے تھے، لیکن اسے قلاش ہو جانے کی کوئی پروا نہیں تھی۔ محبت کے بدلے بے وفائی اور پشت کے وار کا سانحہ اس قدر غمگین کر دینے والا تھا کہ اب اجڑنے کا ڈر نہیں رہا تھا۔

وہ اس چیز کو لے کر ضرورت سے زیادہ لاپروا تھا کہ پیسے ختم ہو جانے کے بعد وہ اپنی گزراوقات کیسے پوری کرے گا۔ شاید اس نے خود کو ختم کرنے کا یہ انوکھا طریقہ ڈھونڈ نکالا تھا۔

وہ چاہتا تو نیوجرسی پرنسٹن یونی ورسٹی واپس جا سکتا تھا، یا کم از کم اپنے کلاس فیلوز کے پاس تو جا ہی سکتا تھا، لیکن وہ یہاں بالکل کنگال اور بے یارو مددگار ہو جانے کے بعد بھی وہاں جانے کی سوچ پر کوئی مثبت فیصلہ کرنے کی قوت نہیں رکھتا تھا۔

پھر ایسے ہی دنوں میں سے ایک دن شائن کلب میں گر کر اس کا بازو فریکچر ہو گیا اور اسپتال کے بیڈ پر لیٹے لیٹے اسے احساس ہوا کہ اس نے اپنی زندگی کا کیا حال کر لیا ہے۔

"جو بے وفا ہیں ان کے لیے اپنی زندگی، اپنا کیریر داؤ پر مت لگاؤ۔" بابا زلاری نے اسے سمجھایا تھا اور جسے وہ اب سمجھا تھا۔

چند دن کے بعد اسپتال میں ہی جب اس نے اپنے بیڈ کی سائیڈ پر آبی للی کے پھولوں کا گلدستہ دیکھا تو جیسے بڑے لمبے عرصے کے بعد اس کا سویا ہوا دماغ جاگا تھا۔

"کیا یہ واقعی میرے لیے ہیں۔" اس نے نرس سے ایک بار پھر تصدیق چاہی تھی۔

"یس سر۔۔۔ یہ آپ کے لیے ہی ہیں۔۔۔ ایک لڑکی ان کو رکھ کر گئی ہے۔۔۔ کیا ان میں کوئی کارڈ نہیں ہے؟"

"نہیں۔۔۔ کوئی کارڈ نہیں ہے۔"

وہ حیران ہوا تھا کہ اس کے لیے ایک اجنبی شہر میں کون پھول رکھ کر جا سکتا ہے۔ ہسپتال سے ڈسچارج ہونے کے بعد پھر اس کی ملاقات اس لڑکی سے ہو گئی تھی۔ وہ جو انسانوں سے کتراتا پھر رہا تھا، نہ جانے کس مانوس کشش کے باعث اس کے قریب بیٹھ گیا تھا۔

زندگی کی طرف واپس آنے کے لیے اس لڑکی نے ہی اس کی مدد کی تھی۔ اسی نے شہرام کی رہائش کا بندوبست بھی کیا تھا۔۔۔ اور کتنا پیارا سا نام تھا اس لڑکی کا۔۔۔ بیانکا۔۔۔

✡ ✡ ✡

مفقود لڑکی۔۔۔ بیانکا۔

ایک ماہ بعد اپنے ہوش و حواس بحال کرنے میں کامیاب ہوئی تھی۔

سب سے پہلے اس نے جس شناسا چہرے کو دیکھا وہ چہرہ کیٹی کا تھا۔ رابن کو نمبر دے کر اس نے کیٹی کو وہاں رچرڈ ہاؤس میں ہی بلا لیا تھا۔

"بیانکا۔۔۔" کیٹی نے اس کی حالت دیکھ کر ایک بے اختیار سی چیخ ماری تھی۔ "او گاڈ۔۔۔ کیا ہوا بیانکا تمہارے ساتھ۔۔۔ تم تو حیفہ آنٹی کے ساتھ لبنان میں نہیں تھیں۔"

کیٹی کے اس ایک فقرے نے بیانکا پر اس کی غیر موجودگی کے سارے حالات واضح کر دیے تھے۔ ظاہری بات ہے۔ جو لوگ ایک ایک چیز میں اتنے طاق

تھے' وہ یہ پوائنٹ کیسے بھول سکتے تھے۔

"خدارا مجھے بتاؤ بیانکا... تمہاری اس حالت کے اسباب کیا رہے؟"

کیٹی کی آنکھیں حیرت سے پھٹ رہی تھیں۔

تب بیانکا نے پہلی بار خود کو کسی اور کو ساری تفصیل بتانے کے لیے تیار کیا تھا۔

ڈیڈ الیاس کے قتل سے لے کر حیفہ مام کے قتل تک کی ساری کہانی... جسے سن کر کیٹی کے چہرے کے تاثرات لحہ بہ لحہ ہیبت ناک ہوتے جارہے تھے۔

"کیا حیفہ آنٹی... کیا حیفہ آنٹی کی ڈیتھ ہوگئی؟" کیٹی سب سن لینے کے باوجود بھی بے یقینی کی کیفیت میں تھی۔

"ہاں..." آنسو بیانکا کا چہرہ بھگونے لگے تھے۔ کیٹی نے اس کے کانپتے وجود کو اپنی بانہوں میں سمولیا تھا۔

"تمہارے باپ کے خاندان والے اس قدر گھٹیا نکلے... صرف جائیداد کی خاطر انہوں نے اتنے ظلم کیے۔" کیٹی کی اپنی آنکھیں غم سے نم ہوچکی تھیں۔

"کتنا تلاش کیا... میں نے اور آریز نے تمہیں... تم لوگوں کا گھر بھی بند تھا... بڑی مشکلوں سے تمہارے پرانے اپارٹمنٹ کا ایڈریس حاصل کرپائے ہم لوگ... لیکن اپارٹمنٹ بھی بند تھا... اور وہاں کسی کو تم لوگوں کے وہاں شفٹ ہوجانے کی خبر بھی نہیں تھی۔ پھر احمد کے ذریعے ہی پتا چلا کہ تم اور حیفہ آنٹی لبنان جاچکے ہو... اپنے آبائی ملک... حیفہ آنٹی کے خاندان کے پاس... مجھے اور آریز کو تو یقین ہی نہ آیا کہ تم اور حیفہ آنٹی اس طرح اچانک بھی جاسکتے تھے' بنا کسی کو کچھ بتائے... لیکن پھر سوچا کہ شاید کچھ مجبوری آگئی ہو... واپس آؤ گے تو پوچھوں گی کہ اس طرح اچانک جانے کی وجہ کیا تھی؟

جہاں تک مجھے یاد ہے' اتنی دیر تک احمد ہی تمہاری پراپرٹی کو لک آفٹر کرتا رہا ہے... وہ کس قدر اطمینان سے تمہاری پراپرٹی اور اسٹور کا کیئر ٹیکر بنا رہا... یقیناً" اس نے جعلی پاور آف اتھارٹی بھی بنوا رکھا ہوگا... کسی کو خبر بھی نہ ہوئی کہ وہ لوگ اندر ہی اندر اس قدر گھناؤنا کام کررہے ہیں۔"

بیانکا خاموشی سے سنتی رہی تھی اور بے آواز روتی رہی تھی۔

"میں... میں تمہارا غم کس طرح ہلکا کروں بیانکا! میری کچھ سمجھ میں نہیں آرہا۔" کیٹی خود کو لاچار محسوس کررہی تھی۔

"مجھے یہاں سے لے جاؤ کیٹی... مجھے گھر جانا ہے... آریز کو بلاؤ' مجھے اس سے ملنا ہے۔"

"فی الحال ہمیں پولیس اسٹیشن جانا ہے۔" کیٹی نے کہا تو بیانکا نے اسے حیرت سے دیکھا تھا۔

"پولیس کے پاس جانے کا بھلا اب کیا فائدہ ہوگا کیٹی۔"

"یہ تم پولیس والوں پر چھوڑ دو... قاتل اور چور کہیں نہ کہیں اپنا سراغ ضرور چھوڑ جاتے ہیں۔"

"وہ لوگ بہت بے خوف' بہت گھناؤنے ہیں کیٹی... مجھے ان سے خوف..."

"تمہیں ان سے ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں... پولیس ہمارے ساتھ ہوگی۔"

"پولیس ان کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکے گی۔" بیانکا نے مایوسی سے کہا تھا۔

"نہیں ایسی بات نہیں ہے۔ کچھ چیزوں کو پولیس عام لوگوں کی نسبت زیادہ جانتی ہے... یقیناً" کوئی حل نکل آئے گا۔"

"کوئی حل نہیں نکلے گا... وہ لوگ ہر صورت بچ جائیں گے کیونکہ وہ بہت سازشی ہیں۔"

"تم ہمت سے کام لو اور اٹھو... ہم دیر نہیں کریں گے۔ ہم یہ کام آج ہی کریں گے۔"

کیٹی' بیانکا کے منع کرنے کے باوجود اسے لے کر اسی دن پولیس کے آفس گئی تھی۔ بیانکا کی ساری بات کو بہت توجہ سے سنا گیا تھا۔

"آپ ہمارے ساتھ چل کر اس گھر اور ان لوگوں کی نشاندہی کریں۔" آفیسر نے کہا تو بیانکا کو مزید حیرت ہوئی تھی۔ یہ درخواست ایک طرح کی کارروائی شروع

ہو جانے کا ابتدائی مرحلہ تھا۔ بیانکا کی طبیعت جیسے کافی دنوں کے بعد ٹھیک ہوئی تھی۔

"کیا واقعی اب بھی کچھ ہو سکتا ہے۔" اس سوچ نے اسے ذہنی طور پر مستحکم کیا تھا اور کیٹی نے جیسے ایک ہی دن میں کوئی مشن مکمل کر لیا تھا۔

"اب دیکھنا ان لوگوں کو کیسی سزائیں ملتی ہیں۔ کسی کی ساری جائیداد کو نگل لینا اور قتل کر دینا اتنا آسان نہیں ہوتا۔۔۔ تمہاری حالت اتنے دنوں خراب نہ رہی ہوتی تو یہ کارروائی اگلے دن ہی سے شروع ہو جاتی' لیکن خیر ابھی بھی زیادہ دیر نہیں ہوئی۔ قاتلوں کی آزادی کے دن زیادہ نہیں رہے۔"

دو گھنٹوں کے طویل سفر کے بعد وہ لوگ کنیکٹی کٹ کے مضافات میں بنا پھول والی سورج مکھی کی فصل والے تاحد نگاہ پھیلے کھیتوں کے درمیان بنے بڑے سے زرعی ہاؤس میں آئے تھے۔

اطلاعی گھنٹی بجانے کے بعد جو چہرہ برآمد ہوا بیانکا اس چہرے کو ہرگز نہیں پہچانتی تھی۔ وہ تو کسی درمیانی عمر کی مردنما امریکی عورت کا چہرہ تھا۔

"مسٹر غفار۔۔۔ جلال اور احمد۔۔۔ کیا یہ ان لوگوں کا گھر ہے؟" پولیس کے ایک آفیسر نے پوچھا تھا۔

کیٹی اور بیانکا بھی گاڑی میں سے باہر نکل آئی تھیں۔

"نہیں' یہ ان لوگوں کا گھر نہیں ہے' یہ ان کا گھر تھا' اب یہ ہماری ملکیت ہے۔ محکمہ زراعت نے یہ گھر اب ہمیں الاٹ کر دیا ہے۔ وہ اس گھر کے پرانے رہائشی تھے۔" امریکی مردنما عورت نے کہا تھا۔

"آپ لوگوں کو یہ گھر کب الاٹ ہوا؟"

تقریباً" چالیس دن پہلے۔۔۔ لیکن ہم لوگوں کو یہاں شفٹ ہوئے ایک ماہ ہی ہوا ہے۔۔۔ دراصل ان لوگوں نے گھر ایک ماہ پہلے ہی خالی کیا تھا۔ پاکستان جانے کے لیے ان کی سیٹیں کنفرم نہیں ہو رہی تھیں۔

"پاکستان۔۔۔"

فاصلے سے بھی اس نے یہ لفظ سن لیا تھا اور ایک بار پھر اس نے خود کو کائناتی بلیک ہول کے دہانے پر کھڑا پایا تھا۔

"آپ ہمیں اس گھر کے الاٹمنٹ کی فائل چیک کروا سکتی ہیں؟"

"جی ضرور۔۔۔" عورت دروازہ بند کر کے اندر غائب ہو گئی تھی۔ چند لمحوں بعد وہ واپس باہر آئی تو اس کے ہاتھ میں ایک فائل بھی تھی۔

پولیس آفیسر نے فائل کے صفحے الٹ پلٹ کر کے اسے جانچا تھا۔

"تو کیا وہ لوگ پاکستان جا چکے ہیں؟" فائل پر نظریں گاڑے بارعب پولیس آفیسر نے پوچھا تھا۔

"میری معلومات کے مطابق تو ایسا ہی ہے۔"

"ٹھیک ہے۔۔۔ ہمیں وقت دینے کے لیے آپ کا شکریہ۔"

فائل پکڑ کر اور سر ہلا کر خاتون نے دروازہ بند کر لیا تھا۔ افسردہ کیٹی نے سہارا دے کر بیانکا کو گاڑی میں واپس بٹھایا تھا۔ جو امید اس نے بیانکا کو دلائی تھی وہ شروع ہونے سے پہلے ہی ختم ہو گئی تھی۔ آنے والے دنوں میں بیانکا کو پتا چلا کہ ڈیڈ الیاس اور حیفہ مام کے محنت سے بنائے گئے سارے اثاثوں کو ان شیطان صفت لوگوں نے کیسے یکے بعد دیگرے اونے پونے بیچا اور پاکستان فرار ہو گئے۔ بیانکا نے دل میں انہیں ڈھیروں بددعائیں دی تھیں۔ تاہم قرار اسے پھر بھی نہیں آیا تھا۔

اور ان دنوں اس نے ایک بار پھر خود کو ذہنی توازن کھو دینے سے بڑے جتنوں سے بچایا تھا۔

☼ ☼ ☼

مور پنکھوں سے سجی شام' دن کے چوبارے پر گھات لگائے چاند کے جام میں انڈیلی جانے لگی تھی۔ افق کی ست رنگی دھار معدوم ہوتے ہوئے اپنے مقسوم کے ہاتھوں مجبور ہو کر منتشر ہونے لگی تھی۔ اس نے بند آنکھوں میں نظر آتے روشنیوں کے الوہی نقطوں کی طرح اس منظر کو بڑے دل سے دیکھا اور گم ہو جانا چاہا تھا۔ اب تو ویسے بھی وہ ان ہی مناظر کی کا بک

میں قید ہونے جارہی تھی۔
ایک ایک کر کے اس نے آسمان کے رنگ دیکھے تھے۔ آخر بار... پھر سے سفید، بھوری، بنفشی، ارغوانی، زور آسا اور دھواں آسا غبار سا پھر اس نے کھڑکی کو بند کر دیا تھا۔

وہ نیند کی ڈھیر ساری گولیاں کھا چکی تھی۔
باتھ روم میں آ کر اس نے ٹھنڈے اور گرم پانی والے باتھ ٹب کے دونوں نلکوں کو پوری طرح سے گھما ڈالا تھا۔

اس کے پاس ایک سادہ سا وائٹ لباس تھا۔ آج شام کے لیے اس نے اس لباس کو ہی منتخب کیا تھا۔ وہ باتھ ٹب میں لیٹ گئی تھی۔ گرم اور ٹھنڈے پانی کی اکٹھی دھار اس کے پاؤں پر کسی منہ زور جھرنے کی طرح پڑنے لگی تھی۔ ٹب آہستہ آہستہ بھرنے لگا تھا۔
اس نے پاؤں کو اونچا کر کے سر کو پوری طرح سے ٹب کی سطح پر لگا دیا تھا۔ اس کے اعصاب ڈھیلے پڑنے لگے تھے۔

بیانکا خود کشی کرنے جارہی تھی۔
اس اتنے بہت سارے گزرے دنوں میں بہت کچھ ہو گیا تھا۔

''بیانکا! جو ہونا تھا' وہ ہو گیا ہے۔ گزرے وقت اور گزر چکے رشتوں کو کوئی واپس نہیں لا سکتا... اب بہتر یہ ہی ہے کہ تم صبر سے کام لو... اور سب کچھ اللہ پر چھوڑ دو... اس کے علاوہ تم اور کچھ کر بھی تو نہیں سکتیں... تمہاری صحت کے لیے بھی ضروری ہے کہ تم باہر نکلو... اس طرح تمہارا ذہن بھی بٹے گا۔'' کیٹی نے ایک دن اس سے کہا تھا۔

خود کیٹی کے لیے بھی اس طرح روز روز بیانکا کی طرف آنا اور اس کی دیکھ بھال کرنا مشکل ہوتا جارہا تھا۔ وہ اپنی ایک چھوٹی بہن اور ایک بھائی کی واحد کفیل تھی اور اسے اپنی جاب سے اس طرح روز روز چھٹی نہیں مل سکتی تھی۔

''دوسری یہ بات اب حقیقت ہے' چاہے تم اسے مانو یا نہ کہ اب تمہارے پاس زیادہ کچھ نہیں بچا... بینک میں موجود پیسے بھی اگر اسی طرح خرچ ہوتے رہے تو ظاہری بات ہے' ایک دن وہ سیونگ بھی ختم ہو جائے گی۔ اس لیے... بھی... اور دوسرے اپنے خول سے باہر نکلنے کے لیے تمہیں کوئی کام کرنا چاہیے۔ میری ایک دوست ہے مارٹا... وہ کسی شائن نامی کلب میں کام کرتی ہے' وہ ہی مجھے وہاں کسی جاب کے بارے میں بتا رہی تھی' لیکن ایک تو مجھے میوزک کی کچھ زیادہ سمجھ بوجھ نہیں ہے... دوسرا میں ایڈون کے گھر خوش ہوں' لیکن میں نے تمہارے لیے تم سے بنا پوچھے ہی مارٹا کو ہاں کر دی ہے' مجھے پتا ہے کہ تمہیں میوزک کا شروع سے ہی جنون رہا ہے۔
تم ڈی جے لائیو پرسنل اپیرنس (Live personal Appearance D.J) کی جاب بہت آسانی سے کر لوگی یہ کوئی اتنا مشکل کام نہیں ہے مارٹا تمہیں سب سمجھا دے گی۔ میں نے اسے تم پر گزری ساری داستان بھی سنائی ہے۔ اسے تم پر گزرے سارے حالات پر بہت دکھ ہوا ہے' وہ تمہارے ساتھ مکمل طور پر تعاون کرے گی۔
پائیونیر Pioneer کو بس ایک آدھ بار سمجھنے اور اس کی (کیز Keys) کو یاد رکھنے کی ضرورت ہوتی ہے پھر یہ کام بہت آسان لگتا ہے۔ خصوصاً'' ان کے لیے جو میوزک کو بہت پسند کرتے ہیں۔ تمہاری اس بارے میں کیا رائے ہے بیانکا؟''
بیانکا بیڈ پر نیم دراز مستقل طور پر چھت کو گھور رہی تھی۔ کیٹی کو شک گزرنے لگا کہ اس کی کسی بھی بات کو ذرہ برابر دھیان سے بھی نہیں سنا گیا۔
''بولو بیانکا... وہ کلب بھی زیادہ مصروف نہیں ہے۔ تمہارا کام یقیناً'' انہیں پسند آجائے گا۔''
''آریز... آریز کو یہ کام پسند نہیں آئے گا کیٹی!'' بڑی دیر کے بعد بیانکا نے کہا تھا اسے کنوینس کرتے کرتے کیٹی نے رک کر منہ بنایا تھا۔
''کیوں اس میں ایسی کیا برائی ہے؟''
''ڈانس کلب کے ماحول زیادہ اچھے نہیں ہوتے...''

"تمہیں میں وہاں ڈانس کرنے کا تو نہیں کہہ رہی۔۔۔ اور ماحول تو انسان خود بناتا ہے۔۔۔ مارٹا کو بھی میں نے کبھی جینز اور ٹی شرٹ کے علاوہ کسی دوسرے ایسے لباس میں نہیں دیکھا جسے تم لوگ ذرا ناپسند کرتے ہو۔۔۔ باقی اگر تمہارا کام انہیں پسند آگیا تو تم اپنی ڈیمانڈز ان کے آگے رکھ دینا۔ جس طرح کے بھی تحفظات تمہیں درکار ہوں۔"

"آریز۔۔۔ کب واپس آئے گا کیٹی؟"

"ایسی سہل جاب بار بار نہیں ملتی۔ تم ابھی زیادہ ٹف کام کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہو۔"

"تم مجھے کسی بھی طرح آریز کا فرانس والا کانٹیکٹ نمبر لادو۔۔۔ میرا اس کے گھر جانا مناسب نہیں، ورنہ میں خود چلی جاتی۔۔۔ کیا پندرہ دن گزر نہیں گئے؟"

"وہ ابھی واپس نہیں آیا۔۔۔ اس کے ڈیڈ نے کہا تھا کہ اسے فرانس میں دس دن مزید لگیں گے۔"

"تو پھر اس کے آنے تک انتظار کرلو۔۔۔ میں اس سے پوچھ کر ہی کوئی فیصلہ کرسکتی ہوں۔" کیٹی سمجھ سکتی تھی کہ بیانکا کو اس وقت جذباتی وابستگی کی کتنی ضرورت تھی اور آریز کے علاوہ اب دنیا میں اس کے پاس بھلا بچا ہی کیا تھا۔

"اور اگر اس نے انکار کردیا تو؟"

"تو تم اپنی دوست کو بھی انکار کردینا۔"

"ٹھیک ہے' وہ آئے تو اس سے پوچھ لینا۔" کیٹی نے اسے اچھی طرح سے کمبل اوڑھایا تھا۔

"اب تم سو جاؤ۔۔۔ ڈاکٹر نے تمہیں آرام کرنے کے لیے کہا ہے۔"

کیٹی نے ساتھ ساتھ تاکید کی تھی۔ بیانکا نے سونے کے لیے نیم وا آنکھوں کو بند کرلیا تھا۔

اگلے دن صبح جانے سے پہلے کیٹی نے اسے بریک فاسٹ بنا کر معمول کی طرح بیڈ پر ہی دے دیا تھا۔ خود وہ بیڈ کے ایک کونے میں بیٹھ گئی تھی۔

"تم جاؤ کیٹی! تمہیں دیر ہو رہی ہوگی۔"

کیٹی اپنی جگہ سے نہیں ہلی تھی بلکہ وہ عجیب سی نظروں سے بیانکا کو دیکھنے لگی تھی۔

"میری بات غور سے سنو بیانکا!" کیٹی نے سرگوشی کے انداز میں کہا تھا۔

بیانکا چونکی تھی' چچا جلال نے بھی فون پر اسے یہ ہی کہا تھا اور پھر بعد میں ڈیڈ الیاس کی موت کی خبر ملی تھی۔ بیانکا کے چہرے کے سارے رنگ یک دم نچڑ گئے تھے۔

"آریز فرانس میں نہیں۔۔۔ وہ یہاں ہی ہے۔۔۔ امریکا میں۔۔۔ دس دن پہلے وہ فرانس سے واپس آچکا ہے۔" کیٹی نے اپنے سابقہ انداز میں بات جاری رکھی تھی۔

منہ تک لے جاتا مفن بیانکا کے ہاتھ سے گر گیا تھا۔

"تم کیا کہنا چاہتی ہو کیٹی۔۔۔ تم کیا بتانا چاہ رہی ہو؟"

"تم تو ٹھیک ہونے کا نام نہیں لے رہی تھیں' اس لیے میں نے تم سے آکر جھوٹ بولا کہ آریز ابھی بھی فرانس میں ہی ہے' جبکہ میں تمہارے پاس آتے وقت ایک دن آریز کے گھر چلی گئی تھی۔ میں نے ان کو وہ ساری باتیں بتائیں جو تم نے مجھے بتائی تھیں' ان لوگوں نے سنا اور افسوس کا اظہار کیا۔ بعد میں' میں نے آریز سے کہا کہ وہ میرے ساتھ چلے تم سے ملنے کے لیے۔۔۔ تب ہی اس کے ڈیڈ اسے لے کر دوسرے کمرے میں چلے گئے۔۔۔ اندر جانے ان دونوں میں کافی دیر تک کیا بات چیت ہوتی رہی' بہرحال آریز پھر کمرے سے باہر نہیں نکلا تھا۔

اس کے ڈیڈ نے مجھے کہہ دیا کہ جو کچھ ہوا' اس پر ان کو دکھ ہے' لیکن اب وہ اپنے بیٹے اور بیانکا کا ملنا پسند نہیں کریں گے۔"

میں تو شاکڈ رہ گئی اور میری کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ میں ان سے کیا کہوں۔ پھر بھی ڈھیٹ بن کر میں نے ان سے آریز کو بلوانے کا کہہ دیا جس پر انہوں نے صاف صاف انکار کردیا۔ میں واپس آگئی۔ اگلے دن صبح میں تمہاری یونیورسٹی گئی تھی۔ آریز سے ملنے۔۔۔ وہ مجھے ملا اور مجھے حیرت ہوئی جب اس نے بھی اپنے ڈیڈ والی

بات ہی کہی۔

"بیانکا اب ہمارے اسٹیٹس کے برابر نہیں رہی۔ میرے والدین اس رشتے کے لیے نہیں مانیں گے۔ اور میں ان کے سامنے ضد نہیں کر سکتا۔" "تم جانتی ہو کہ میرے اور بیانکا کے درمیان کس طرح کی محبت تھی۔ یہ بس ایک تعلق تھا۔ مجھے افسوس ہے کہ وقت آنے پر میں اس کی کسی بھی طرح کی مدد کرنے سے قاصر ہوں۔"

یقین جانو! میرا دل چاہا میں اس خبیث کا منہ نوچ لوں، لیکن میں ایسا نہ کر سکی۔ میں اسے منالیتی اگر وہ مان جانے کے لیے تیار ہوتا۔ اس نے کہا اور چلا گیا۔ تمہاری حالت ٹھیک نہیں تھی، ورنہ میں تمہیں یہ ساری باتیں تب ہی بتا دیتی، لیکن اب.... لیکن اب ان باتوں کو چھپانے کا کوئی فائدہ نہیں.... میں تمہیں مزید اذیت نہیں دے سکتی۔ ایک نہ ایک دن تو تمہیں ان چیزوں کو فیس کرنا تھا۔"

کیتھی بہت کچھ کہہ کر خاموش ہو گئی اور دو آنسو بے تحاشا ضبط کرنے کے باوجود بھی بیانکا کی گھور سیاہ آنکھوں سے نکل کر اس کے گالوں پر پھسلتے چلے گئے۔ مشرق زوال کے سمندر میں آئے جوار بھاٹے سے نکل کر برآمد ہوا تھا۔ رنگوں کے سہل عکس جا بجا پھیلنے اور پھسلنے لگے تھے۔ پرنور صبح اپنے آغاز پر تفاخر سے لبریز تھی۔ اس پرنور صبح کے تھال میں سے بیانکا نے اپنے لیے ایک جام اٹھانا تھا اور اس کے اندر اتنی سکت ہی تو نہ رہی تھی۔

"خود کو مضبوط کرو بیانکا!" کیتھی نے کہتے ہوئے اس کے شانے پر تھپکی دی تھی۔

"میں چلتی ہوں.... مجھے دیر ہو رہی ہے۔ شام میں جلدی آنے کی کوشش کروں گی۔" کیتھی اپنا ہینڈ بیگ اٹھا کر اٹھی تھی اور دھیمی چال چلتے ہوئے دروازے تک گئی تھی۔

"کیتھی!" بیانکا نے رندھی آواز سے پکارا تو کیتھی نے وہیں کھڑے کھڑے گردن موڑی تھی اور سوالیہ نگاہوں سے بیانکا کو دیکھا تھا۔

"تم اپنی دوست سے بات کرو، میں وہ ڈی جے کی جاب کرنے کے لیے تیار ہوں۔" جھکی آنکھوں سے بیانکا نے کہا تو کیتھی نے اسے فخریہ نگاہوں سے سراہا تھا۔

رات کو وہ دونوں شائن کلب میں تھیں۔

میوزک کی اسے جتنی بھی سمجھ تھی، وہ ساری اس نے کلب منیجر تھامس کو بتا دی تھی، نئے پرانے البمز اور ملکی غیر ملکی سنگرز کے نام سمیت.... کچھ سازوں کے بارے میں بیانکا کی معلومات حیرت انگیز تھیں۔ اگرچہ اس ساری معلومات کی اس جاب میں ضرورت تو نہیں تھی، لیکن یہ باتیں اس کے حق میں گئی تھیں.... مارٹا نے اسے تین دن لگاتار آنے کے لیے کہا تھا تاکہ وہ Pioneer (پائیونیر) کے بارے میں اسے مزید اچھی طرح سمجھا سکے۔

چوتھے دن اس کا ٹیسٹ ہونا تھا جس کی بنا پر اسے وہ جاب ملنی تھی۔

وہ تین دن لگاتار آتی رہی تھی اور مارٹا کی مدد سے اس نے Pioneer چلانا سیکھا تھا، چوتھے دن یہ کام اس نے مارٹا کی مدد کے بغیر کیا تھا اور نیچے کھڑے ہجوم سمیت کلب کی انتظامیہ اور خود مارٹا بھی دنگ سی رہ گئی تھی۔

"کچھ انوکھا ہے.... کچھ ایسا انوکھا جسے میں سمجھ نہیں پا رہا۔" منیجر تھامس نے ٹریک ختم ہو جانے کے بعد اس سے کہا تھا۔

"تمہارا کام بہت اچھا ہے.... تمہاری انگلیوں میں جادو ہے.... لیکن کل سے سیڈ (افسردہ) گانوں کا انتخاب مت کرنا۔ فاسٹ میوزک اور زندگی سے بھرپور ٹریک کسی بھی کلب کے لیے ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتے ہیں۔"

اسے سراہنے کے بعد منیجر نے نصیحت کی تھی۔ جسے وہ بہت اچھی طرح سمجھ گئی تھی۔

لیکن اگلے دن منیجر اور بیانکا دونوں اس وقت حیران ہوئے تھے جب نیچے ڈانس فلور پر کھڑے ہجوم نے اسے کل والا ٹریک چلانے کی ہی فرمائش خوب زور و

شور سے کی تھی۔

اس کی انگلیوں میں Tishrei cloud (ابرِنیساں) قید تھی۔ اس کے حوالے سے یہ بات پھر جلد ہی مشہور ہوگئی۔ یہ چیز اس کی ذات کی علامت بن گئی اور برسنے والے بادل سے بھلا کب کوئی یہ بات پوچھتا ہے کہ برس جانے کے بعد وہ خود کس قدر کھوکھلا ہو جاتا ہے۔

اس جاب سے اسے یہ فائدہ ضرور ہوا تھا کہ وہ رفتہ رفتہ ذہنی طور پر قدرے نارمل ہونے لگی تھی، لیکن دو ماہ بعد اس کے سارے زخم جیسے پھر سے تازہ ہوگئے تھے۔

وہ ایک روڈ شو تھا جو ٹی وی پر چل رہا تھا۔ سڑک پر نظر آتے بہت سارے لوگوں کے ہجوم میں سے احمد کو پہچاننے میں اسے سیکنڈ کا ہزارواں حصہ بھی نہیں لگا تھا اور وہ جیسے سانس لینا بھول گئی تھی۔

تو کیا احمد امریکا میں ہی تھا۔ کیا وہ پاکستان نہیں گیا تھا یا کوئی بھی پاکستان نہیں گیا تھا، بلکہ وہ سب امریکا کی ہی کسی اور ریاست میں منتقل ہوگئے تھے۔ بیانکا یہ بات اگلے دن پتا کرپائی تھی کہ وہ روڈ شو فلوریڈا میں ہو رہا تھا۔

احمد اور سارے گھرانے کا پتا کرنا اب زیادہ مشکل نہیں رہا تھا۔ اگر وہ تب ہی پولیس کو کارروائی کرنے سے نہ روکتی تو ایئرپورٹ انکوائری کے ذریعے یہ بات آسانی سے پتا چل سکتی تھی کہ دراصل وہ لوگ پاکستان واپس گئے ہی نہیں۔

بیانکا نے ہر چیز کے لیے خود کو بہتر جانا تھا۔

"اب مجھے جلد بازی سے کام نہیں لینا... مجھے بھی اسی طرح کی پلاننگ کرنی ہے جیسے ان لوگوں نے میرے اور حیفہ مام کے لیے کی تھی۔" وہ بہت کچھ سوچنے لگی تھی۔

اب غصے یا عجلت میں اٹھایا گیا کوئی بھی قدم اس کے کام کو خراب کرسکتا تھا، یا اسے منزل سے ہی کوسوں دور کرسکتا تھا یہ بھی ہوسکتا تھا کہ غفار، جلال، احمد وغیرہ اپنا نیا گھربار چھوڑ کر پھر سے کہیں اور شفٹ ہو جائیں۔

تب انہیں دوبارہ ڈھونڈنا تقریباً ناممکن ہوگا اور قدرت نے جو موقع اسے دیا ہے اسے وہ ضائع نہیں کرے گی، بیانکا نے کیٹی سے بات کی تھی۔

"یہ تو بہت بڑی گڈ نیوز ہے بیانکا! کہ وہ لوگ ابھی تک امریکا میں ہی ہیں۔ پر اب تم کیا کرنا چاہتی ہو؟ تم ایک بار پہلے بھی پولیس کو کارروائی کرنے سے روک چکی ہو۔" کیٹی نے پوچھا تھا جبکہ بیانکا کچھ اور ہی سوچ رہی تھی۔

یہ بات تو طے تھی کہ وہ لوگ اس قدر چالاک تھے کہ ان کے پاس پولیس سے بچنے کے بھی ہزاروں طریقے ہوسکتے تھے اور بیانکا کو جھوٹا ثابت کرنے کے لیے انہیں زیادہ محنت کرنے کی بھی ضرورت نہیں پڑتی تھی۔ ان لوگوں نے یقیناً" اس چیز کے بارے میں بھی کافی کچھ سوچ رکھا ہوگا۔

"پہلے مجھے کسی اچھے وکیل سے ملنا ہوگا۔ اس سے مشورہ کرنا ہوگا۔"

بیانکا نے ساری رات مزید سوچنے کے بعد اگلے ہی دن اپنے منصوبے کو عملی جامہ پہنانا شروع کیا تھا اور مزید ایک ہفتے تک وہ وکلا آفسز میں دربدر بھٹکتی رہی تھی۔

تقریباً" سب نے ہی اس کی بات کو سیریس ہو کر سنا تھا، لیکن وہ آگے سے اسے کوئی مشورہ نہیں دے پائے تھے۔

"مسٹر الیاس کا قتل صرف آپ کا قیاس ہے اور مسز حیفہ کا بھی... جائیداد کی منتقلی کے وقت آپ خود یونین کے آفس میں موجود تھیں یہ بات ثابت کرنا بہت مشکل ہے کہ آپ اس وقت دوائیوں کے زیر اثر تھیں۔"

"ڈیڈ باڈیز کے پوسٹ مارٹم کروانے پر آپ تیار نہیں ہیں اور اگر ایسا ہوگیا اور رپورٹ میں واضح طور پر کوئی شہادت ان کے خلاف نہ گئی تو۔"

"مسز حیفہ کی موت الرجی کی وجہ سے بھی ہوسکتی ہے۔ ہوسکتا ہے ان کو سورج مکھی سے الرجی ہو اور اس بات سے آپ بے خبر ہوں۔"

"جس طرح کی کہانی آپ سنا رہی ہیں یہ کیس تو الٹا آپ پر بھی پڑ سکتا ہے کہ پہلے آپ نے اپنے ہی لوگوں کو مہنگے داموں اپنی پراپرٹی بیچی پھر اب یہ طریقہ اپنا کر واپس حاصل کرنا چاہ رہی ہیں۔"

وہ ساری زندگی کسی وکیل کے آفس میں نہیں گئی تھی اب گئی تو زندگی کی ایک نئی جہت سے متعارف ہو رہی تھی۔ مایوسی کے باعث بیانکا کا دماغ چکرانے لگا تھا۔

اپنا کیس وہ کسی عام سے وکیل کو دینا بھی نہیں چاہتی تھی ایسا کرنا کھیل کھیلنے سے پہلے ہی ہار جانے کے مترادف تھا۔

"کیتھی.... تم مشہور زمانہ وکیل ایڈون کے گھر کام کرتی ہو نا.... کیا تم میری ایڈون سے ملاقات کروا سکتی ہو؟"

"ہاں.... ٹھیک ہے۔"

کیتھی نے بے دلی سے کہا تھا کیوں کہ وہ جانتی تھی کہ یہ کام کس قدر مشکل ہے۔ مشہور زمانہ اور معروف ترین وکیل ایڈون سے سفارش کے ذریعے وقت مانگنا کیتھی کے لیے بہت کٹھن مرحلہ ثابت ہونے والا تھا۔

ایک ماہ کے سخت اذیت ناک انتظار کے بعد اس کی ایڈون سے ملاقات ہوپائی تھی۔ صرف بیس منٹ کی اور ملاقات کے اختتام تک بیانکا نے خودکشی کرنے کا پکا ارادہ باندھ لیا تھا۔

ایڈون کو ہائیر کرنا بیانکا کی پہنچ سے کافی دور تھا۔ دوسرا روتے ہوئے جس انداز سے بیانکا نے ایڈون کو ساری کہانی سنائی ایڈون کو یہ کیس بڑا ہی جھول دار اور بیانکا ہی کوئی سازشی سی لڑکی نظر آئی۔ اور گھر واپس آتے وقت وہ ڈھیر ساری نیند کی گولیاں لیتی آئی تھی۔ وہ سب کچھ سمیت اب زندگی بھی ہار دینا چاہتی تھی۔

ٹب آہستہ آہستہ بھرنے لگا تھا پانی اس کے سر سے کان کی طرف آنے لگا تھا۔

وہ اپنے بچپن سے لے کر اب تک کے سارے واقعات کو ایک ایک کر کے یاد کرنے لگی تھی نہیں یاد نہیں کر رہی تھی بلکہ واقعات تصویروں کی شکل میں اس کی نظروں کے سامنے آنے لگے تھے۔

حیفہ مام نے کہا تھا ڈیڈ الیاس نے سمجھایا تھا۔ نہیں۔ اسے کوئی ایسی بات یاد نہیں کرنی تھی جس میں امید کی ذرا سی بھی چاشنی ہوتی وہ مرنے کا فیصلہ کر چکی تھی اور یہ اس کا آخری فیصلہ تھا۔

اس کا سر پانی میں ڈوب چکا تھا۔

وہ نیند کی کیفیت میں گم ہوگئی تھی وہ مرنے کے لیے تیار ہوگئی تھی۔ بھرے ہوئے ٹب کا تلاطم زدہ پانی بہہ کر نیچے فرش پر گرنے لگا تھا بیانکا پوری طرح اس میں ڈوب چکی تھی۔

"مجھ سے وعدہ کرو بیانکا....! تم ایسا ہرگز نہیں کرو گی.... میری جان ہی کیوں نہ چلی جائے تم ان لوگوں کو ایک پینی بھی نہیں دو گی۔" بیانکا کا وجود خوفناک حد تک ساکت تھا۔

"ان ساری چیزوں میں الیاس کے ہاتھوں کی خوشبو رچی بسی ہوئی ہے۔ میں ان چیزوں کو کبھی ان کے ناپاک ہاتھوں میں جاتا ہوا برداشت نہیں کرپاؤں گی۔"

"تم ایسی سوچ کو بھی گناہ سمجھو گی۔"

"ہمت نہیں ہارنا میری بچی.... گھبرانا نہیں.... ورنہ تمہارے ڈیڈ الیاس کی روح بے امان جائے گی۔"

ذہن کو ہر طرح کے خیالات سے پاک کردینے کے باوجود بھی وہ ان باتوں کو جھٹک نہیں پارہی تھی۔

دفعتاً رات کے جام میں انڈیلی جانے والی شراب کا رنگ سنہری ہوگیا۔ آہن گر سپاہیوں نے اپنی اپنی تلواریں میان سے نکال لیں۔ یہ اشارہ تھا۔ جنگ لڑنے کا آخری دم تک....

پھر بڑی دیر کے بعد بیانکا کے ساکت وجود میں حرکت پیدا ہوئی تھی اور پانی کا ایک بلبلا سطح تک آیا تھا۔

"ہمت نہیں ہارنا میری بچی.... گھبرانا نہیں...."

بیانکا ایک جھٹکے سے اٹھی تھی اور ٹب سے باہر منہ نکال کر اس نے بھرپور سانس لینے کے ساتھ ساتھ

کھانستا بھی شروع کر دیا تھا۔

وہ ایسے کیسے مر سکتی ہے؟ وہ ایسے کیوں مرے؟ تاکہ اس کے دشمن ہر لحاظ سے مطمئن ہو جائیں؟

نہیں، وہ اپنی آخری سانس... اپنے خون کے آخری قطرے تک ان سے بدلہ لینے کی کوشش کرتی رہے گی۔

مجھے اس اندھیرے ماضی کو یاد رکھنا ہے۔ اس اندھیرے میں ایک چیز چمکتی تھی... حیفصہ مام کی آنکھوں میں آئے آنسو... جن کی یاد مجھے آگ کی طرح جھلساتی ہے... مجھے اس آگ کی آبیاری کرنی ہے... دنوں سالوں کے گزرنے سے کوئی فرق نہیں پڑے گا... صدیوں کی لگاتار بارش بھی اس آگ کو ٹھنڈا نہیں کر پائے گی۔ یہاں تک کہ یہ آگ ایک تناور درخت بن جائے گی۔ ایک زہریلا درخت... پھر اس درخت پر ایک سیب اگے گا اور وہ زہریلا سیب گناہ گاروں کو چکھنا پڑے گا۔

☆ ☆ ☆

ایک نارنجی خط نے ورق آفتاب کے تار کو کھینچ کر پورے آسمان کی وسعت پر پھیلا دیا تھا۔ مکمش سے بجے آسمان میں سہ پہر کے ارغوانی رنگ تحلیل تھے اور سیلاب نور میں ڈوبے ہوئے محل طوفانی روشن سراپے اوڑھے ہوئے تھے۔

دونوں خاموش ہو چکے تھے۔ اتنا سب کچھ بتا دیا گیا تھا کہ مزید کہنے کو الفاظ نہ ملتے تھے۔

"پھر یہ اس نے تمہیں واپس کر دیا؟" بیانکا نے شہرام سے پوچھا تھا۔ خود اپنا ہی دھیان بدلنے کے لیے اس کے گلے پر لٹکے تعویذ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اور آنکھوں کی نمی کو انگلی کی پورے سے صاف کر لینے کے بعد...

"نہیں، واپس نہیں کیا... بلکہ میرے منہ پر دے مارا..." خنجر کی دھار کی طرح کے تیز لہجے میں شہرام بولا تھا۔

"تو تم نے پھر یہ خود کیوں پہن لیا؟"

"اب میں صرف اپنے آپ سے محبت کروں گا یہ عہد کرنے کے بعد... میں نے اسے خود پہن لیا۔ میں اپنا محبوب خود ہوں۔ میں عاشق ہوں تو صرف اپنی ذات پر، فدا ہوں تو صرف اپنی زندگی پر۔"

شہرام کی بات کو سنتے ہوئے بیانکا نے اس کے کرخت چہرے کو دیکھا تھا۔

"جب ہمارے ساتھ کچھ برا ہوتا ہے تو ہم اپنی زندگی کے نئے عہد ضرور کرتے ہیں۔"

"کرنے بھی چاہئیں... کیا تم نے بھی خود سے کوئی عہد کر رکھے ہیں؟"

"ہاں... بہت سارے..."

"کیا... کیا میں جان سکتا ہوں۔"

"یہ ہی کہ انتقام کی آگ کو سب کچھ خاک ہو جانے سے پہلے راکھ نہ ہونے دوں گی۔"

شہرام چونک کر ایک ٹک بیانکا کی طرف دیکھتا رہ گیا تھا۔ اسے اس پتھر چہرے سے خوف سا آنے لگا تھا۔ جو ایک دم ہی اس کے معصوم چہرے پر پنجے گاڑے محسوس ہوا تھا۔

"تم نے عہد نہیں کیا... تم نے خود کو اذیت دینے کا سامان اکٹھا کر لیا ہے۔" بیانکا نے عجیب سی نظروں سے شہرام کی طرف دیکھا تھا۔ ان نظروں میں ایک قہر سا دبا ہوا تھا۔

"بابا زلاری تمہیں نہیں سمجھا سکے تھے اور تم مجھے نہیں سمجھا سکتے۔" شہرام لاجواب ہو گیا تھا۔

"میں صرف اتنا کہہ رہا ہوں کہ..."

"اب چلیں... کافی دیر ہو گئی ہے۔" بیانکا نے شہرام کی بات کاٹی تھی۔ اس کا صاف مطلب تھا کہ وہ اس موضوع پر مزید بات کرنے کا ارادہ نہیں رکھتی۔

"ہاں... چلو..."

دونوں اکٹھے اٹھے تھے۔ دہکتی سہ پہر میں شام کی جوت جاگنے لگی تھی۔ ادھ کھلی کلیاں واپس بند ہونے لگی تھیں اور بھینی خوشبو میں حبس کا بے جا عمل دخل شروع ہو چکا تھا۔

وکٹورین طرز کے بنے آہنی گیٹ کی طرف بڑھتے

ہوئے شہرام ایک دم سے بیانکا کے آگے آیا تھا۔
"تم نے یہ تو بتایا نہیں کہ تم بدلہ لوگی کیسے؟"
"ایک وکیل ہے..... مجھے امید ہے کہ میں اسے اپنا مقدمہ لڑنے کے لیے راضی کرلوں گی۔ وہ راضی ہو گیا تو مسئلہ صرف اس کی فیس کا رہ جائے گا۔ فیس کے معاملے میں اس کے اصول دوسروں سے مختلف ہیں۔ میں اس کی فیس کے پیسے ہی اکٹھے کر رہی ہوں۔ میرا میش اپ ہٹ ہو گیا تو یہ کام جلد ہی ہو جائے گا۔"
پارک کے دروازے سے نکل کر دونوں ٹیکسی اسٹینڈ کی طرف بڑھنے لگے تھے۔ سرد ہوا کے باعث پارک کا رش ختم ہو چکا تھا۔ سناٹے میں بیانکا کی ہیل کی آواز گونجنے لگی تھی۔
"میں تمہاری کامیابی کے لیے دعا گو رہوں گا۔" شہرام نے کہا تو بیانکا نے مسکرا کر شہرام کی طرف دیکھا تھا۔
"ہفتے کی رات کو کلب آؤ گے نا..... وہ میش اپ کے ریلیز ہونے کا دن ہے۔" ٹیکسی کے اندر بیٹھتے ہوئے بیانکا نے پوچھا تھا۔
"ہاں..... ضرور..... کیوں نہیں..... تمہاری زندگی کا انتہائی اہم دن ہے..... میں بھلا اسے کیسے مس کر سکتا ہوں۔"
"تب تک شیو مت کرنا۔" بیانکا نے سنجیدہ لہجے میں عجیب سی بات کی تھی۔
"کیا....." وہ حیران ہوا بڑے معصومانہ انداز سے.....
"کیوں....." اور نہ سمجھنے والے انداز سے وہ بیانکا کو دیکھنے لگا۔
بیانکا نے لحہ بھر کو توقف کیا تھا اور یہ توقف شہرام کو بہت طویل لگا تھا۔
"شاید تمہیں معلوم نہ ہو..... تمہاری شیو پر بالوں سے دو دائرے بنتے ہیں..... اور..... اور یہ تم پر بہت اچھے لگتے ہیں..... خدا حافظ۔"
ٹیکسی آگے بڑھ گئی تھی۔ وہ وہی کھڑا ٹیکسی کی پشت کی دور ہوتی روشنی کو دیکھتا رہ گیا تھا۔ پھر بے اختیار ہی اس نے اپنے رخساروں پر ہاتھ پھیر کر اپنی شیو کے بالوں کو محسوس کیا تھا اور مسکراہٹ اس کے لبوں پر آگئی تھی۔ ایک لمبے عرصے کے بعد اس کی مسکراہٹ سے سچائی جھلکی تھی۔

☼ ☼ ☼

بیانکا نہیں جانتی تھی کہ آسمان پر نظر آتے کبوتروں کے غول میں ایک زاغ آبی (آبی پرندہ) بھی ہے۔
ہفتے کی رات کو کلب کی اینورسری کے دن اس نے اپنا میش اپ ریلیز کیا تھا اور نتیجہ توقع سے بڑھ کر آیا تھا۔
میش اپ پر محنت کی گئی تھی جو اس کے ایک ایک سر سے جھلک رہی تھی۔ ساتھ ہی ویڈیو بھی ریلیز کردی گئی تھی اور ویڈیو اپنی طرز کی مختلف ویڈیو تھی۔ جس میں میوزک کے ساتھ صرف رنگ بدلتے دکھائے گئے تھے۔ دراصل ایسا صرف کم بجٹ کی وجہ سے کیا گیا تھا اور بیانکا کو یقین بلکہ مجسم یقین تھا کہ اس کے مرتب کیے گئے گانوں اور دھنوں کو عوام کی پذیرائی حاصل کروانے کے لیے کسی اعلا ویڈیو کی ضرورت نہیں ہے۔ جو کچھ وہ اپنے تجربے کی بنا پر اس میش اپ کو دے چکی ہے وہ کسی کو بھی دیوانہ کردینے کے لیے کافی ہے۔
اس لیے اپنے میش اپ کی سی ڈیز مختلف میوزک کمپنیز کو بھجوا دی تھیں اور سوشل میڈیا پر اس کے میش اپ کو کافی مداح بھی مل چکے تھے۔ یہ سب ایک ہفتے کے اندر اندر ہوا تھا۔
شہرام بھی بیانکا کے لیے خوش تھا۔ کلب کی اینورسری پر میش اپ کی ریلیز سے لے کر وہ ہر نئے پڑاؤ پر بیانکا کے ساتھ ساتھ رہا تھا۔ بیانکا کو بس اب میوزک کمپنیز کی طرف سے ملنے والے رسپانس کا انتظار تھا۔ آج کل اسے ہر چیز بڑی اچھی اور خوب صورت لگنے لگی تھی۔ ضیاریز (روشنی دینے والا) اس پر مہربان ہو چکا تھا۔ بڑے لمبے عرصے کے بعد اس کی آنکھیں چندھیا رہی تھیں۔
لیکن پھر نہ جانے کیا ہوا۔ روشنی کی دھاروں میں

سیاہی نہ جانے کیسے بھر دی گئی۔ کبوتروں کے غول میں جو ایک زاغ آبی بھی تھا تو رفتہ رفتہ وہ بھی سب کی نظروں میں آنے لگا اور دیکھتے ہی دیکھتے سارا غول زاغ آبی سے بھر گیا اور وہاں صرف ایک کبوتر رہ گیا۔

یہ زاغ آبی برطانیہ سے آیا تھا۔ اسٹار لائٹ کا ہورائزن اسٹار لائٹ تین نوجوان خوب صورت لڑکوں پر مشتمل برطانیہ کا مشہور میوزک بینڈ۔۔۔ انہوں نے اپنا میش اپ ہورائزن جاری کیا تو وہ دیکھتے ہی دیکھتے شہرت کی بلندیوں کو چھونے لگا۔ ایسا عموماً ”ہوتا ہی ہے کہ ہر طرف لوگ اپنے اپنے کام کو لے کر کوششیں اور محنت کررہے ہوتے ہیں“ لیکن بدقسمتی کا عنصر وہاں نمایاں ہوا جب بیانکا کو پتا چلا کہ اسٹار لائٹ کے ہورائزن میں موجود دس گانوں میں چار گانے وہ بھی ہیں جن کا انتخاب بیانکا نے بڑی محنت کے بعد کیا تھا۔

اس کا جو خیال تھا کہ اس کے منتخب کیے گئے گانوں کو لے کر امریکا کا کوئی بھی شخص میش اپ بنانے کا سوچ بھی نہیں سکتا تو یہ خیال درست تھا۔ امریکا میں کسی نے واقعی ایسا نہیں سوچا تھا‘ لیکن اس کے خیال کی حدود برطانیہ تک نہ جاتی تھیں۔ اسٹار لائٹ امیر ترین گروپ تھا۔ ان کے میوزک کی کوالٹی کا بیانکا کے میش اپ سے بھلا کیا مقابلہ کیا جاسکتا تھا۔ اسپیڈ اجوف قابل لڑکا تھا اور اس کی کمپنی اچھا کام کررہی تھی‘ لیکن اسٹار لائٹ کے مقابلے میں وہ ابھی جدوجہد کرنے والی چیونٹی کی حیثیت رکھتی تھی۔ نہ جانے کس زعم‘ کس امید کے سہارے بیانکا پھر بھی پرامید رہی۔

ہورائزن (افق) دیکھتے ہی دیکھتے افق پار کرنے لگا اور بیانکا کا میش اپ ارتھ کوئیک (زلزلہ) دن بدن ریکٹر اسکیل پر اپنی شدت پہلے سے کم ظاہر کرنے لگا۔

لاتعداد میوزک کمپنیز کی طرف سے بھی کوئی جواب نہ آیا۔

ایسا نہیں تھا کہ وہ بری طرح گری تھی۔ بس وہ اچھی طرح اٹھ نہ سکی تھی اور اس دن اس نے اپنی ہار کو تسلیم کرلیا‘ جب کلب کے منیجر تھامس نے اسے ارتھ کوئیک چلانے کے بجائے ہورائزن چلانے کا کہا۔

شہرام نے ایک طرح سے اسے سمجھانے‘ دلاسا دینے اور نئی امید دلانے کی کوشش کی تھی‘ لیکن بیانکا ان دنوں کوئی نصیحت سننے کے موڈ میں نہیں تھی۔ اتنی ساری کوششوں‘ دعاؤں اور جدوجہد کے بعد وہ پھر سے ہار گئی تھی۔ یہ بات غم کے پہاڑ کی طرح اس کے ذہن پر سوار تھی اور یہ غم کا پہاڑ کسی اور طرف سرکنے کا نام نہیں لے رہا تھا۔

تھامس کی ہورائزن چلانے کی ہدایت والے دن شہرام نے بیانکا کا ایک الگ ہی روپ دیکھا تھا۔ وہ بیانکا کو بہت نرم مزاج سمجھتا تھا۔ نہیں جانتا تھا کہ یتہ خانے کی قید نے اس کی ساری نرم مزاجی کو ختم کرکے اس کے اندر تک تلخی اور نفرت بھر دی ہے۔ بیانکا نے تھامس کو اتنی کھری کھری سنائی تھیں کہ شہرام کو شک ہونے لگا تھا کہ دراصل تھامس بے چارہ دونوں کانوں سے بہرہ ہوچکا ہے۔

بیانکا نے بتایا تھا کہ صرف اس کی وجہ سے اس غیر معروف کلب نے ترجمانی کی ہے اور وہ جب چاہے جہاں چاہے جاسکتی ہے۔ اس کلب سے بہت بڑی آفرز ہمیشہ اس کے پاس رہی ہیں۔

تھامس نے دوبارہ اس سے کوئی بات نہیں کی تھی۔ اس کا لہجہ منت بھرا ہوگیا تھا اور بھرپور انداز میں معذرت کرنے کے بعد اس نے بیانکا کو کھلی چھٹی دے دی تھی کہ وہ جس طرح کے گانے اور میش اپ چلانا چاہے چلاسکتی ہے۔ اس پر کسی طرح کی حدود لاگو نہیں ہوں گی۔

لیکن تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ منیجر کی بات سے بیانکا نے پورے ملک کے نظریے کو اخذ کرلیا تھا۔ وہ پیچھے رہ گئی اور اسٹار لائٹ کا ہوریزن آگے نکل گیا۔ اس نے بالآخر تسلیم کرلیا۔

اپارٹمنٹ آکر وہ اپنا سر پکڑ کر بیٹھ گئی تھی اور نہ جانے کتنی دیر ایسے ہی بیٹھی رہی تھی۔ اس میش اپ کے لیے اس نے اپنی باقی ماندہ دولت کو بھی خیرباد کردیا تھا۔ آگ میں جھونک دیا تھا۔

اب وہ صحیح معنوں میں مفلس۔۔۔ بلکہ مفلس تر

ہو گئی تھی۔

باتھ روم کا ٹب اسے شاید ایک بار پھر بلا رہا تھا۔

بند کھڑکی کے نیچے کی اتھاہ گہرائی دکھا رہی تھی۔

اس نے ایک نظر کھلے دروازے سے نظر آتے ٹب کی سفید اور شفاف سطح کو دیکھا اور پھر بند کھڑکی سے باہر نظر آتی رات کی تاریکی کو۔۔۔۔ اگر اس بار وہ ٹب میں جانے کے بجائے ایک ہی بار میں کھڑکی سے کود جائے تو؟ کھڑے ہو کر وہ گہری نظروں سے کھڑکی کا مشاہدہ کرنے لگی۔ کھڑکی کے شیشے پر اسے اپنا پریشان حال عکس نظر آیا تھا۔ دس انگلیوں نے اس کے بالوں کو بے ترتیب کر دیا تھا۔ اسے اپنا وجود خشک پتوں کی طرح بکھرا ہوا نظر آیا۔ وہ کسی سال خوردہ درخت کی طرح بس گر جانے کو تیار تھی۔ لیکن اس گرنے سے پہلے نہ جانے کہاں سے آتی روشنی کے ایک ننھے سے قطرے نے چکور شیشے کو منور کر دیا۔

اس گھر میں اگر ایک باتھ ٹب تھا تو کیا ہوا۔ اس گھر میں ان گنت آئینے بھی تو تھے۔ آئینے جو کبھی جھوٹ نہیں بولتے۔

اور پھر رات کے دو بجے عجیب بات ہوئی۔

بیانکا نے اپنا سب سے عمدہ لباس زیب تن کیا۔ پھر لباس کی مناسبت سے ہی اس نے جوتے پہنے اور جیولری کا انتخاب بھی اس نے خاص احتیاط سے کیا۔

گھر میں موجود سارے میک اپ کو اس نے کسی ماہر مصور کی طرح خود پر ملا تھا اور رولر سے بالوں میں کرل بھی ڈالے تھے۔

اس ساری تیاری میں دو گھنٹے لگے تھے۔

صبح چار بجے تمام کاموں سے فارغ ہونے کے بعد اس نے کارنس کی لکڑی پر اپنی دونوں ہتھیلیاں جما کر اپنے جسم کا سارا بوجھ وہاں منتقل کیا تھا اور خود کو بڑے مفصل انداز سے دیکھنا شروع کیا تھا۔

لمبی پلکیں۔۔۔ بھرے بھرے ہونٹ۔۔۔ اور گہری سیاہ آنکھیں۔۔۔ اسے اپنے لبنانی ہونے پر ناز ہوا تھا۔

”یہ ہے وہ جام۔۔۔ تو یہ ہے وہ جام۔۔۔ جو بیک وقت شہد بھی ہے اور زہر بھی۔۔۔“ خود کو آئینے میں دیکھتے ہوئے اس نے خود سے کہا تھا۔

اور اس رات دو اور حقیقتوں کا ادراک ہوا تھا بیانکا پر۔

ایک تو یہ کہ وہ کسی صورت سالے جرتیج (مس لبنان) سے کم خوب صورت نہیں ہے دوسری یہ کہ۔۔۔ جتنے پیسے اس نے میش اپ پر لگائے اگر خود پر لگائے ہوتے تو آج اسے اس طرح مایوس نہ ہونا پڑتا۔

ایک بے اختیار۔۔۔ دل فریب سی مسکراہٹ اس کے لبوں پر آئی تھی۔ اس نے اپنی گردن اور چہرے پر لکسو کا اسپرے کیا تھا۔

آج اس کا خود کو بڑی دیر تک دیکھتے رہنے کا ارادہ تھا۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)